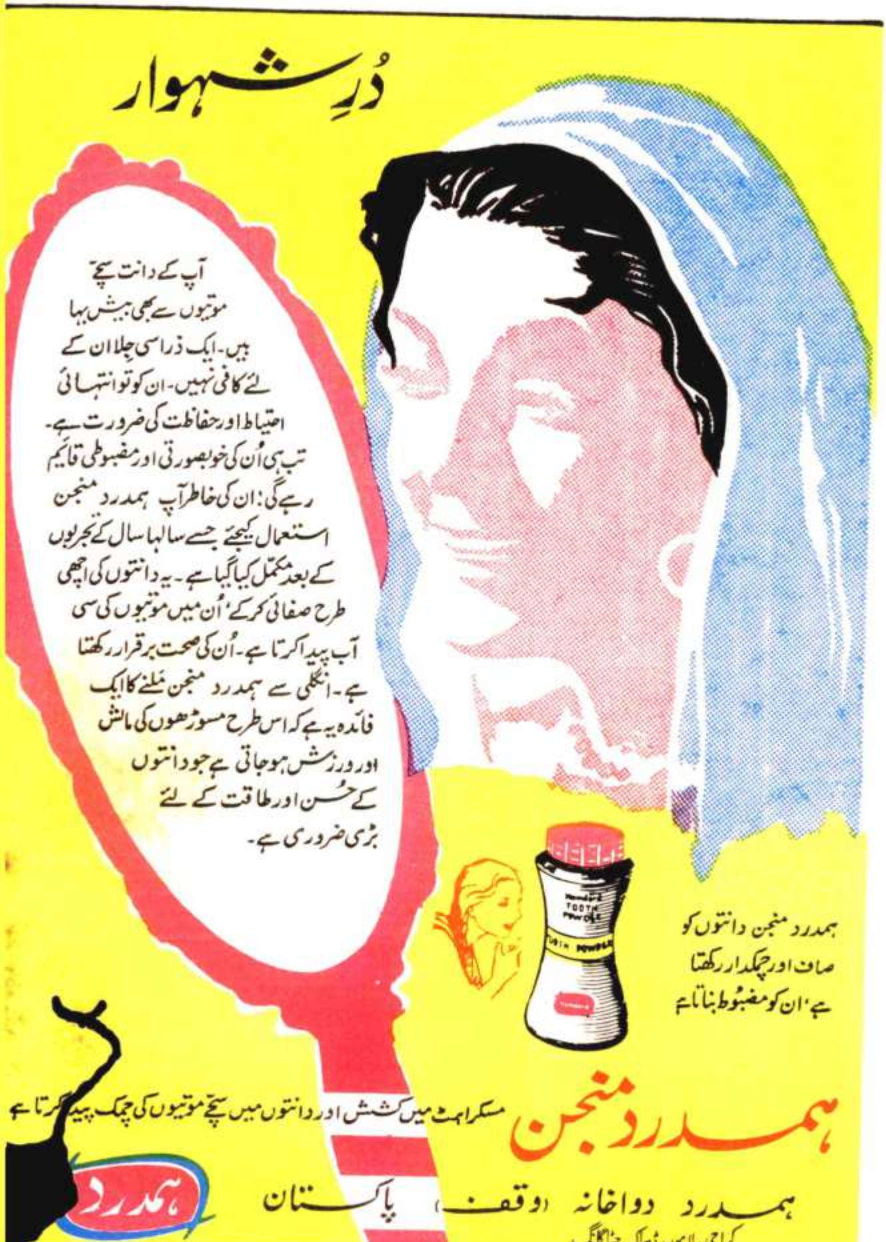
ہمدرد

نونہال




دُرِ شہوار
آپ کے دانت سچے
موتیوں سے بھی بیش بہا
ہیں۔ایک ذراسی چِلا ان کے
لئے کافی نہیں۔ان کو توانتہائی
احتیاط اور حفاظت کی ضرورت ہے۔
تب ہی اُن کی خوبصورتی اور مضبوطی قائم
رہے گی: ان کی خاطر آپ ہمدرد منجن
استعمال کیجئے جسے سالہا سال کے تجربوں
کے بعد مکمّل کیا گیا ہے۔ یہ دانتوں کی اچھی
طرح صفائی کر کے' اُن میں موتیوں کی سی
آب پیدا کرتا ہے۔اُن کی صحت برقرار رکھتا
ہے۔انگلی سے ہمدرد منجن مَلنے کا ایک
فائدہ یہ ہے کہ اس طرح مسوڑھوں کی مالش
اور ورزش ہوجاتی ہے جو دانتوں
کے حُسن اور طاقت کے لئے
بڑی ضروری ہے۔
ہمدرد منجن دانتوں کو
صاف اور چمکدار رکھتا
ہے' ان کو مضبوط بناتا ہے
ہمدرد منجن
مسکراہٹ میں کشش اور دانتوں میں سچے موتیوں کی چمک پیدا کرتا ہے
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی۔ لاہور۔ ڈھاکہ۔ چٹاگانگ

مئی ۱۹۶۵ء

مدیرِ اعلا: حکیم محمد سعید
مدیرِ معاون: مسعود احمد برکاتی
فون: ۴۷۷۵۰

شمارہ ۵ جلد ۱۲

دفتر ہمدرد نونہال
ہمدرد ڈاک خانہ، کراچی ۱۸

ہمدرد نونہال

جاگو، جگاؤ

سچائی میں بڑی طاقت ہے۔ سچ بات کہنا چاہے مشکل معلوم ہو، لیکن کہنے والے کی قوت میں سچ کہنے سے اضافہ ہوتا ہے۔ اس قوت کا اندازہ اُس وقت ہوتا ہے، جب جھوٹ بولنے والے کا پول کھلتا ہے اور سچ کا بول بالا ہوتا ہے۔

جھوٹ انسان کو کم زور بناتی ہے اور سچائی طاقت بخشتی ہے۔

حکیم محمد سعید



قیمت:- ایک رسالہ: ۷۵ پیسے ـــــ سالانہ: آٹھ رُپے

روٹھی ہوئی ہے منّی

وحیدہ نسیم



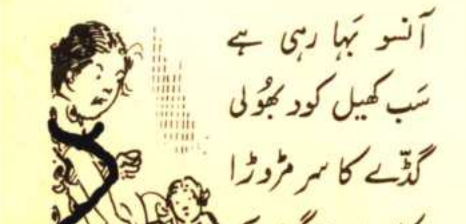


روٹھی ہوئی ہے منّی
روٹھی ہوئی ہے منّی

کونے میں سر جھکائے بیٹھی ہے منہ پھلائے
غصّے میں یہ بھری ہے تیوری بہت چڑھی ہے
مٹّی کریدتی ہے یا ناک پونچھتی ہے
خود بال موڑتی ہے دامن مروڑتی ہے



پوچھوں تو کچھ نہ بولے ڈانٹوں اگر تو رو دے
اٹھ کر نہ آئے گی اب کھانا نہ کھائے گی اب
کچھ بڑبڑا رہی ہے آنسو بہا رہی ہے
غصّے میں ہے یہ پھولی سب کھیل کود بھولی
گڑیا کا ہاتھ موڑا گڈّے کا سر مروڑا
آئی ہے سب سے لڑ کے بیکار میں جھگڑ کے



روٹھی ہوئی ہے مُنّی





مَیں نے بہت مَنایا — ہر ہر طرح بُلایا
لیکن نہ اُٹھ کے آئی — تب لائی میں مِٹھائی
پھر یہ کہا کہ آؤ — کھانا ہے گر تو کھاؤ
ورنہ مَیں کھا رہی ہوں — اور کھا کے جا رہی ہوں
مُنّی نے مجھ کو دیکھا — پھر سر جھکا کے سوچا



میں نے اٹھا کے بَرفی — تھوڑی سی منہ میں رکھ لی
گھبرائی اب تو مُنّی — پچھتائی اب تو مُنّی
کچھ وقت اور گزرا — میں نے پلٹ کے دیکھا
تیوری کے بَل مِٹائے — مجھ پہ نظر جمائے
کونے سے اُٹھ چکی تھی — چُپ چاپ بڑھ رہی تھی

بَرفی کی سمت لیتی
مُنّی کھسک رہی تھی

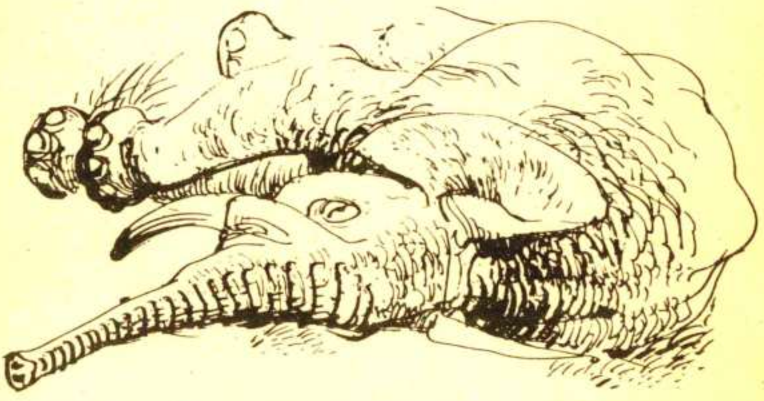




مناظر صدیقی

جانوروں کی نیند

ہاتھی، چڑیا، بطخ اور بندر کس طرح سوتے ہیں؟



ہاتھی اس طریقے سے صرف اس وقت سوتا ہے جب وہ پہلے پہرے دار مقرر کر لیتا ہے

ننھے میاں کو کہانیاں سُننے کا بڑا شوق تھا۔ وہ روزانہ رات کو نانی اماں کے پلنگ پر پہنچ جاتے اور کہانیاں سُنانے کی فرمائش کرتے۔ نانی اماں بھی انھیں بڑے مزے مزے کی کہانیاں سُنائیں۔ جن بھوتوں کی کہانیاں ___ چڑیوں اور پرندوں کی کہانیاں ___ بادشاہوں اور شہزادے شہزادیوں کی کہانیاں ___ ننھے میاں دو تین کہانیاں سن کر نانی اماں ہی کے پلنگ پر سو جاتے، پھر امی کو اٹھ کر انھیں لانا پڑتا۔ کہانیاں سُننے کا شوق اس قدر بڑھ گیا تھا کہ بغیر سُنے انھیں نیند ہی نہ آتی۔

ایک دن نانی اماں ننھے میاں کی خالہ کے ہاں چلی گئیں۔ اب ننھے کو فکر ہوئی کہ رات کہانی وہ کس سے سنیں گے۔ اسی فکر میں رات ہو گئی۔ جب سب لوگ کھانا کھا چکے تو ننھے میاں امی کے پاس پہنچے اور کہانی سنانے کی فرمائش کی، لیکن بے چارے کو کہانی کے بجائے گھر کی سننے کو ملی۔ روتے بسورتے ابّو جان

کے پاس پہنچے۔ وہ بیٹھے اپنے دفتر کا کچھ کام کر رہے تھے، انھوں نے بھی ننھے میاں کو ڈانٹ دیا۔ اب تو ننھے میاں بڑے پریشان ہوئے۔

باجی رعنا تو شاید اس تاک ہی میں رہتی تھیں کہ کب ننھے میاں رونی صورت بنائیں اور باجی رعنا انھیں چھیڑیں۔ اب باجی رعنا کو موقع ملا تو انھوں نے ننھے میاں کو اتنا چھیڑا کہ بے چارے چیخ چیخ کر رونے لگے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ اسی وقت شاہد ماموں کمرے میں آگئے، ورنہ ننھے میاں کے رونے پر اور باجی رعنا کے چھیڑنے پر امی اتنی پٹائی کرتیں کہ مزہ آجاتا۔

شاہد ماموں کو جب یہ معلوم ہوا کہ ننھے میاں کے رونے کا ریکارڈ اس لیے بجنا شروع ہوا ہے کہ بے چارے کو کہانی سُنانے کے لیے آج نانی اماں گھر میں نہیں ہیں تو شاہد ماموں نے کہا کہ بھئی ننھے میاں آج ہم تمھیں کہانی سُنائیں گے۔

شاہد ماموں کی زبان سے یہ جملہ سُن کر ننھے میاں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ باجی رعنا بھی ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئیں، حالاں کہ وہ ابھی تک ننھے میاں کو چھیڑ رہی تھیں۔

دونوں بچے شاہد ماموں کے پاس جمع ہو گئے تو شاہد ماموں نے کہا:

"دیکھو بچو! ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمھارا خدا بادشاہ۔ آنکھوں دیکھی کہتے نہیں۔ کتابوں پڑھی کہتے ہیں۔ ملک فرانس میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ بادشاہ کا نام تھا لوئی۔ اس بادشاہ کے یہاں ایک ہاتھی پلا ہوا تھا۔ وہ ہاتھی کھڑے کھڑے سویا کرتا تھا اور اپنی سونڈ دو سوراخوں میں سے کسی ایک میں ڈال دیتا۔ یہ دونوں سوراخ اسی ہاتھی نے اپنے اصطبل کی دیواروں میں بنا رکھے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ہاتھی کھڑے کھڑے صرف اس لیے سویا کرتا تھا کہ اس کی جان کی حفاظت کے لیے کوئی سنتری موجود نہ تھا، پھر بہت دنوں بعد وہ ہاتھی مرگیا اور کہانی ختم ہوگئی۔ پیسہ ہضم ہوگیا۔"

ننھے میاں نے کہا، "ماموں! کیا کہانی سچ مچ ختم ہوگئی؟"

"ہاں" شاہد ماموں نے کہا، "کہانی سچ مچ ختم ہوگئی اور تم بھی اب سو جاؤ۔"

ننھے میاں تو مچل گئے کہ ہم اتنی چھوٹی سی کہانی نہیں سنیں گے۔

شاہد ماموں نے کہا، "اب تو سُن چکے۔ پہلے تم سُنی ہوئی کہانی واپس کر دو پھر ہم دوسری بات سُنیں گے۔"

اسی وقت باجی رعنا بھی بیچ میں بول پڑیں، "شاہد ماموں آپ نے تو ادھوری کہانی سناتی ہے، پوری کہانی سُنائیے۔"



گوریلا بندر پتوں کا نرم نرم بستر بنا کر سوتا ہے

" ادھوری کیسی ؟ ہم نے تو پوری کہانی سُنائی ہے ۔" شاہد ماموں نے کہا۔

" واہ ! آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ ہاتھی کو ڈر کس بات کا تھا اور اتنے بڑے فرانس کے بادشاہ نے ہاتھی کی حفاظت کے لیے کوئی پہرے دار کیوں نہیں رکھا، تاکہ بے چارا آرام سے سو سکتا۔" باجی رعنا نے کہا۔

" اب تم نے کام کی بات کی ہے ۔" شاہد ماموں نے کہا، پھر انھوں نے ننھے میاں سے جو ابھی تک ٹھنک رہے تھے ، مخاطب ہو کر کہا " لو بھئی ننھے میاں اب تم پوری کہانی سنو ! "

" قصہ اصل میں یہ ہے کہ ہاتھی خواہ جنگلی ہو یا پالتو، سوتے وقت اپنی حفاظت کے لیے دوسرے ہاتھیوں کو پہرے دار کے طور پر مقرر کرتا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ ہاتھی سُست ہوتا ہے اور نیند سے بیدار ہوتے ہوتے اُسے کافی دیر لگ جاتی ہے ، اس لیے ہاتھی زیادہ تر اونگھ کر اپنی نیند پوری کرتا ہے ۔ عام طور پر جنگل میں بھیڑ بکریوں کی طرح ہاتھی کے بھی غول ہوتے ہیں ۔ جب رات ہو جاتی ہے تو ہاتھی اپنے غول میں سے دو ہاتھیوں کو پہرے دار کے طور پر مقرر کر دیتے ہیں ، تاکہ جب دوسرے ہاتھی سو رہے ہوں تو یہ ہاتھی پہرہ دیں اور اگر کسی قسم کا خطرہ ہو تو یہ سوئے ہوئے ہاتھیوں کو جگا دیں ۔ یہ پہرے دار آدھے گھنٹے تک پہرہ دیتے ہیں، پھر دوسرے دو ہاتھیوں کو جگا کر کھڑا کر دیتے ہیں ۔ اس طرح ہر آدھے گھنٹے کے بعد پہرے دار بدلتے رہتے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ ہاتھی چوبیس گھنٹوں میں صرف چار گھنٹے لیٹ کر سوتا ہے، باقی وقت میں کھڑے کھڑے اونگھ کر اپنی نیند پوری کرتا ہے ۔"

"ماموں تو کیا سب جانور اسی طرح پہرہ دار مقرر کرتے ہیں؟" باجی رعنا نے پوچھا۔

"نہیں بھئی ہر جانور ایسا نہیں کرتا۔" شاہد ماموں نے کہا، "ہر جانور کو قدرت نے علیحدہ علیحدہ عادتیں بخشی ہیں۔"

"ہمیں دوسرے جانوروں کے سونے کا طریقہ بھی تو بتایئے۔" رعنا باجی نے کہا۔

اب ننھے میاں کو بھی شاید ان باتوں سے دلچسپی ہو گئی تھی، چناں چہ انھوں نے بھی فرمائش کی اور کہا،

"ہاں ماموں! ہم بھی سنیں گے۔"

"چلو تو تم ہی بتاؤ کہ کس جانور کے سونے کا طریقہ سنو گے؟" شاہد ماموں نے ننھے میاں سے پوچھا۔

"چڑیوں کا!" ننھے میاں نے مختصر سا جواب دیا۔

"بھئی چڑیاں تو پیروں کے بل کھڑی کھڑی سوتی ہیں۔" شاہد ماموں نے کہا، "لیکن ان کے سونے میں ایک خاص بات ہوتی ہے، جسے دیکھ کر تمھیں تعجب تو ضرور ہوتا ہوگا! اب ہمیں بتاؤ کہ وہ کیا چیز ہے، جسے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے؟"

"ہمیں تو معلوم نہیں وہ کیا چیز ہے۔" دونوں بچوں نے جواب دیا۔

"کبھی تم نے کسی چڑیا کو درخت پر بسیرا لیتے ہوئے دیکھا ہے؟" شاہد ماموں نے پوچھا۔

"ہاں! ہاں! دیکھا ہے۔" باجی رعنا نے جواب دیا، "چڑیاں کسی بھی درخت کی ٹہنی پر بیٹھ کر بسیرا لیتی ہیں۔"

"تو تمھیں کبھی یہ دیکھ کر تعجب نہیں ہوا کہ چڑیا ایک پتلی سی ٹہنی پر بیٹھ کر سو جاتی ہے اور رات بھر گذار دیتی ہے، لیکن اُس ٹہنی سے نیچے نہیں گرتی؟" شاہد ماموں نے پوچھا۔



بطخیں پانی کی سطح پر سوتی ہیں

"ماموں جان! ہم نے تو یہ بات سوچی ہی نہیں تھی۔ چلیے آپ ہی بتا دیجیے۔" باجی رعنا نے کہا۔

"بھئی سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ وہ گر ہی نہیں سکتیں۔" شاہد ماموں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، "ہوتا اصل میں یہ ہے کہ چڑیا کے پنجوں سے لے کر اُس کی ران تک باریک سی ڈوری کی طرح ایک نس ہوتی ہے۔ جب چڑیاں کسی ٹہنی پر بیٹھتی ہیں تو اُن کے پیر ذرا سے ٹیڑھے ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ نس کھنچ جاتی ہے، جو پنجوں کو اتنا موڑ دیتی ہے کہ اس کے نیچے ٹہنی

ے جھک جاتے ہیں اور چڑیاں درخت سے نیچے گر جاتی ہیں، بعض پرندے سردی سے بچنے کے لیے اپنے پروں میں اپنا سر چھپا کر سوتے ہیں۔ جنوبی امریکا میں طوطے کی ایک چھوٹی قسم پائی جاتی ہے۔ یہ طوطے ٹہنیوں سے لٹک کر سوتے ہیں۔ پانی میں رہنے والے بعض پرندے مثلاً بطخیں وغیرہ پانی کی سطح پر سوتی ہیں۔ بطخیں تو پانی کی سطح پر اتنی گہری نیند سوتی ہیں کہ اکثر بے چاری پکڑی جاتی ہیں، کئی سرد ملکوں میں اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ بطخ پانی کی سطح پر سوتی رہی اور برف باری جو شروع ہوئی تو بے چاری اُس برف میں دب گئی۔"

"ماموں مچھلیاں بھی تو پانی کے اندر ہی سوتی ہوں گی۔ ان کے سونے کا طریقہ کیا ہوتا ہے؟" باجی رعنا نے پوچھا۔

"مختلف مچھلیاں مختلف طریقوں سے سوتی ہیں۔" شاہد ماموں نے کہا۔ "مچھلیوں کی ایک خاص قسم ہوتی ہے، جسے سیل کہتے ہیں۔ یہ مچھلی پانی میں نیچے کی طرف غوطہ لگاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیتی ہے اور گہری نیند سو جاتی ہے۔ اس میں مادہ مچھلی غوطہ لگا کر سوتی ہے تو نر پانی کی سطح پر آ کر اونگھتا ہے۔ سوتے وقت جب یہ آنکھیں بند کر لیتی ہیں تو اتنی زور سے سانس لیتی ہیں کہ ان کی آوازیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ تقریباً سولہ مرتبہ لمبے لمبے سانس لینے کے بعد یہ مچھلی اپنے ننھے بند کر لیتی ہے اور گہرے پانی میں ڈوب جاتی ہے۔ چار پانچ منٹ تک یہ پانی کے نیچے رہتی ہے پھر اوپر اُٹھ آتی ہے، لیکن آنکھیں بند ہوتی ہیں اور اسی طرح سوتے سوتے اوپر آ کر بارہ مرتبہ پھر لمبے لمبے سانس لیتی ہے اور پھر اندر چلی جاتی ہے۔ اس طرح تقریباً یہ مچھلی نصف گھنٹے تک سو کر اپنی نیند پوری کر لیتی ہے۔ یہ تو تھا مچھلیوں کے سونے کا طریقہ، اب تم یہ بتاؤ کہ سب سے زیادہ آرام پسند جانور کون سا ہوتا ہے؟"

"ہمیں تو معلوم نہیں آپ ہی بتائیے؟" باجی رعنا نے کہا، پھر کچھ سوچ کر بولیں، "شاہد ماموں آپ تو ہم کو تمام جانوروں کے متعلّق بتا دیجیے، کیوں کہ ہمیں کسی بھی جانور کے متعلّق کچھ نہیں معلوم۔" ننھے میاں نے بھی باجی رعنا کی ہاں میں ہاں ملائی تو شاہد ماموں نے کہا، "اچھا تو اب تم لوگ چپ چاپ بیٹھے سنتے رہو" پھر انھوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

"دنیا میں سب سے زیادہ آرام پسند جانور بندر ہوتا ہے۔ بندروں کی ایک خاص قسم جسے گوریلا کہتے ہیں، سونے کے لیے بڑی محنت سے اپنا بستر تیار کرتا ہے۔ جنگلوں میں رہنے والا گوریلا اور اس کا خاندان مل کر شام ہوتے وقت اپنے لیے انگوروں کی بیلوں کے سائے میں کوئی اچھی سی

جگہ تلاش کرتے ہیں پھر تازہ اور کچی ٹہنیوں کو توڑ کر انھیں آپس میں ایک دوسرے پر اس طرح رکھ دیتے ہیں کہ بالکل اسپرنگ دار بستر تیار ہو جاتا ہے۔ بالکل ایسا بستر جیسا ہمارے گھروں میں نرم نرم گدوں اور اسپرنگ والے صوفوں سے تیار ہوتا ہے۔ بورنیو اور ملایا میں ایک خاص قسم کا بڑا بندر ہوتا ہے، جسے اورنگ اوٹن کہتے ہیں۔ یہ بندر درختوں کی چوٹیوں پر اپنا بستر بناتے ہیں۔ گوریلے کے خلاف یہ اکہرا بستر پسند کرتے ہیں اور عام طور پر درختوں میں اپنے سونے کے لیے ایسی جگہ تلاش کرتے ہیں، جہاں سے دو شاخیں پھوٹی ہوں، پھر دوشاخے میں درختوں کی پتیاں توڑ کر بچھا لیتے ہیں، تاکہ ان کے سونے کے لیے نرم بستر تیار ہو جائے۔ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں کہ درختوں کی پتیاں کہیں ان کے چبھ نہ جائیں، اس لیے ٹہنیوں کے سرے وہ جان بوجھ کر بستر سے باہر کی طرف رکھتے ہیں۔ ان کا بستر عام طور پر گول ہوتا ہے اور اس کی گولائی چار پانچ فیٹ کے قریب ہوتی ہے۔"

اتنا کہنے کے بعد شاہد ماموں کو ذرا سی دیر کے لیے شاہد یہ دیکھنا تھا کہ ننھے میاں اور باجی رعنا غور سے سن بھی رہے ہیں یا نہیں اور جب انھیں اندازہ ہو گیا کہ دونوں بڑے غور سے اُن کی باتیں سُن رہے ہیں تو انھوں نے پھر کہا:

"جانور سونے میں بُرے بُرے خواب بھی دیکھتا ہے اور خراٹے بھی لیتا ہے۔ بعض وقت تو ہاتھی سوتے میں ڈر کر بڑی زور کی آوازیں نکالتا ہے۔ یہ تو تھا بڑے بڑے جانوروں کا قصہ اب سنو کہ کیڑے مکوڑے اور ننھے ننھے جانور بھی سوتے ہیں۔ زیادہ تر کیڑے مکوڑے تو نیند کی حالت میں چلنے کے عادی ہوتے ہیں۔ تتلیاں بھی اکثر سوتے میں ہی پکڑی جاتی ہیں۔ اگر ایک تتلی سوتے میں پکڑی جائے تو وہ اتنی غافل ہوتی ہے کہ پکڑے جانے کے بعد بھی اس کی نیند ختم نہیں ہوتی۔ ایسی حالت میں اگر اُسے چھوڑ دیا جائے تو بہت آہستہ آہستہ زمین پر گرتی ہے۔ ان سب کے علاوہ ننھی منی چیونٹیاں بھی آرام کرتی ہیں۔ تھک جاتی ہیں تو انسانوں کی طرح انگڑائی بھی لیتی ہیں۔ سونے کے لیے تو یہ زمین کے نیچے کی نرم نرم مٹی کو اپنا بستر بناتی ہیں اور پھر اپنے پیر سکوڑ کر سو جاتی ہیں۔ عام طور پر یہ چیونٹیاں تین گھنٹے تک اپنی نیند پوری کرتی ہیں۔ پھر جب ان کی آنکھ کھلتی ہے تو انسانوں کی طرح انگڑائی لیتی ہوئی کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ انگڑائی لیتے وقت ان کے پیر پھیل جاتے ہیں۔ اکثر ان کا ننھا منا بدن انگڑائی لینے سے لرز بھی جاتا ہے۔ کبھی کبھار یہ اپنا منھ کھول کر جماہی بھی لیتی ہیں۔"

یہاں تک کہنے کے بعد شاہد ماموں نے ننھے میاں پر نظر ڈالی تو وہ سو چکے تھے اور باجی رعنا بھی جماہیاں لے رہی تھیں، اس لیے انھوں نے باجی رعنا سے بھی سونے کے لیے کہا اور ننھے میاں کو امی کے پلنگ پر لٹا کر چلے گئے۔



محمود نے اپنا ارادہ پورا کر دکھایا

محمود ایک غریب، ماں باپ کا بیٹا تھا۔ اس کے سات بہن بھائی تھے اور اس کے بڈھے دادی دادا بھی ان کے پاس رہتے تھے۔ اس کے والد شہر میں ایک اسکول میں فارسی کے اُستاد تھے۔ اسکول میں تنخواہ بہت کم تھی۔ وہ صبح سویرے ایک دو ٹیوشن کرتے، پھر اسکول کا وقت ہوجاتا اور وہاں چلے جاتے۔ اسکول سے چھٹی ہوتی تو شام کی ٹیوشن کا وقت ہوجاتا۔ اِس طرح محمود کے باپ تمام دن کام کر کے رات کو واپس آتے۔ سات بچے اور دو میاں بیوی اور دو اس کے بڈھے ماں باپ۔ ایک شخص کمانے والا گیارہ کھانے والے تھے۔ محمود کی ماں بہت نیک اور سلیقہ مند تھیں۔ سارے گھر کا کام کاج اور بچوں کی دیکھ بھال کرتی اور جو تھوڑا بہت وقت ملتا اس میں سلائی کرتی۔

بعض اوقات ان کے ہاں دو وقت کے فاقے ہوتے تھے۔ پہننے کو کپڑے بھی اچھی طرح میسر نہیں آتے تھے۔ ان کے پاس رہنے کو اچھا مکان بھی نہیں تھا۔ شہر کی تنگ گلی میں ایک چھوٹا سا مکان تھا، جس میں وہ لوگ رہتے تھے۔ محمود سب سے بڑا بچہ تھا، باقی سب چھوٹے تھے۔ محمود کی عمر بھی کوئی زیادہ نہ تھی۔ وہ صرف بارہ برس کا تھا۔

گلی کے بچوں کو گیند بلا کھیلتے دیکھتا تو محمود ماں سے یا باپ سے گیند بلے کی ضد کرتا اور ماں کہہ دیتی، "کل منگا دوں گی"۔

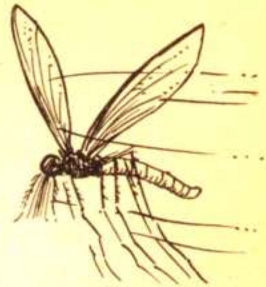
محمود کے بچپن میں وہ کل کبھی نہیں آئی تھی کہ اس کے ابا جان گیند بلا لاسکتے۔

محمُود کے باپ کی کمائی مشکل سے اِتنی تھی کہ گیارہ آدمیوں کو پیٹ بھر کر کھانا اور معمولی کپڑا مل جائے۔ محمود کے ماں باپ کو بہت شوق تھا کہ محمود پڑھ لکھ کر لائق ہو جائے۔ محمُود بہت ذہین اور سمجھ دار تھا۔ اپنے دادی جان اور دادا جان کی خدمت کرتا، ماں باپ کا حکم مانتا اور بھائی بہنوں سے پیار کرتا۔ وہ اسکول بڑے شوق سے پڑھنے جاتا اور خوب دل لگا کر اسکول کا کام بڑی محنت سے کرتا۔ ان کے گھر میں بجلی نہیں تھی۔ تیل کا چراغ بھی کئی کئی راتوں نہیں جلتا تھا۔ وہ گلی میں بجلی کے کھمبے کے پاس بیٹھ کر لکھتا پڑھتا۔ گرمیوں میں مچھر اور پتنگے ستاتے اور جاڑوں میں سردی سے ٹھٹھرتا۔ ماں بہت کہتی، باپ بھی خفا ہوتے۔ دادی جان دادا جان الگ پریشان ہوتے، مگر محمُود پڑھائی سے کبھی نہ گھبراتا، بس اس کو یہی دُھن رہتی کہ مڈل کے اِمتحان میں صُوبے بھر میں اوّل آئے۔ آخر محمُود مڈل میں اوّل آیا۔ اِس طرح میٹرک میں بھی اسے یہ عزت حاصِل ہوئی۔ میٹرک کے بعد محمُود کے ابّا جان اور امّی جان کی خواہش تھی کہ محمُود کِسی دفتر میں ملازم ہو جائے، مگر محمُود نے ماں باپ سے کہا کہ میں کالج میں بھی اوّل آؤں گا اور پھر وظیفہ پاؤں گا، جس سے دوسرے ملک میں تعلیم حاصِل کرنے جاؤں گا۔ اس کے ماں باپ اس کی باتوں پر ہنستے کہ یہ لڑکا کتنا نادان ہے۔ ہمارے پاس کھانے کو نہیں اور یہ ملک بھر میں اوّل آئے گا۔ محمود کی قابلیت کی وجہ سے اس کو کالج میں وظیفہ مل گیا اور فیس بھی معاف ہوگئی تھی اور وہ تنخواہ لے کر دوسرے لڑکوں کو پڑھاتا بھی تھا۔ کالج میں محمُود ایسے اعلا نمبروں سے پاس ہوا کہ حکومت نے اس کو انجنیئری کی تعلیم مکمل کرنے کے لیے امریکا بھیج دیا۔ وہ تین چار سال کے بعد اپنے ملک میں تعلیم مکمل کر کے واپس آیا اور انجنیئر مقرر ہوگیا۔

اس کو محکمے سے بنگلہ رہنے کو اور سرکاری موٹر کار سواری کو ملی اور آخر اس کی ہمّت نے سارے خاندان کے دن پھیر دیے۔ ماں باپ اور دادی جان، دادا جان اور سب بھائی بہن چھوٹے اندھیرے مکان میں نہیں رہتے تھے۔ اب اس کے دوسرے بہن بھائی اچھے اچھے اسکولوں میں تعلیم حاصِل کرتے تھے۔ محمُود کو محنت کا پھل مل گیا۔ یہ اس کی ذاتی ہمّت اور محنت کی برکت تھی۔



مچھّر



سجاد ہاشمی

بِھن بِھن بِھن بِھن گاتے آئے
مچھّر بین بجاتے آئے

اس بِینا میں زہر بھرا ہے — بیماری کا قہر بھرا ہے
تانے بانے ساز کے لے کر — دوڑ پڑے ہیں پورے گھر پر
یہ کاٹا ہے، وہ کاٹا ہے — سارے بدن کو چھلنی کیا ہے
بچّے، بوڑھے، بالک گھر کے — کیسے سوئیں لوگ نگر کے
زہر بھری تلوار ہیں مچھّر — بے چینی کا وار ہیں مچھّر
کچھ بھی کرو، یہ ہر دم سر پر — تانے ہوئے ہیں کالی چادر
ان کی زد سے دُور ہے جالی[1] — یہ گنبد ہے ان سے خالی

بِھن بِھن بِھن بِھن گاتے آئے
مچھّر بین بجاتے آئے



[1] مچھردانی



لومڑی اور لالو کی مرغی

شہر کے باہر کھیت تھے۔ کھیتوں سے پرے ایک بہت گھنا جنگل تھا۔ جنگل میں ایک لومڑی رہتی تھی۔ لومڑی روز دل میں سوچتی، " اُفوہ لالو کسان کی مرغی کتنی موٹی تازی ہے۔ کاش میں اس مرغی کو کھا سکتی۔

لالو کسان شہر سے باہر اپنے کھیت کے کنارے ایک گھر میں رہتا تھا۔ اس کے گھر میں بہت سی مرغیاں پلی ہوئی تھیں۔ ایک کتا بھی تھا۔ جس کا نام کالو تھا اور لالو کسان کی بیوی لالی بھی تھی، جو بہت سگھڑ اور سلیقہ مند تھی اور لالو کے سب کپڑے خود ہی دھویا کرتی تھی۔

ایک دن لومڑی جنگل سے نکل کر لالو کسان کے گھر کے پاس پہنچ گئی۔ اسے مرغیوں کے کڑکڑ انے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ سامنے ہی مرغیوں کا ڈربہ تھا ڈربے کی چھت پر ایک مُرغا سینہ پھلائے



اذان دے رہا تھا اور سب سے موٹی مرغی ڈربے کے سامنے بیٹھی دھوپ سینک رہی تھی۔ لومڑی نے دل میں سوچا، "افوہ، لالو کسان کی مرغی کتنی موٹی تازی ہے۔ کاش میں اس مرغی کو کھا سکتی۔"

لومڑی نے یہ بات اپنے دل میں سوچی اور اسی وقت کالو نے بھونکنا شروع کر دیا۔ لومڑی کالو سے بہت ڈرتی تھی۔ واپس مڑی اور بھاگم بھاگ بس جنگل میں جا کر ہی دم لیا۔ لومڑی نے جنگل میں جا کر سوچا، "افوہ، کالو کتنا خوف ناک کتا ہے۔ اگر کالو نہ ہوتا تو میں مرغی کو چٹ کر جاتی۔"

اگلے دن لومڑی پھر لالو کسان کے گھر پہنچ گئی، ڈربے کے سامنے جا کر اس نے موٹی مرغی کو دیکھا اور مرغے کی اذان بھی سنی۔ لومڑی نے پھر دل میں سوچا، "افوہ، لالو کسان کی مرغی کتنی موٹی ہے۔ کاش میں اس مرغی کو کھا سکتی۔"

لالو کسان کے خوف ناک کتے کالو کو فوراً پتہ چل گیا کہ گھر میں کوئی لالچی لومڑی آ گئی ہے۔ کالو اتنے زور زور سے بھونکا کہ لالو کو بھی پتہ چل گیا ضرور کوئی لومڑی گھر میں آ گئی ہے۔ لالو اپنی لاٹھی لے کر گھر سے باہر نکل آیا۔ لومڑی ڈر گئی اور فوراً الٹے پاؤں جنگل کی طرف بھاگی۔ لومڑی کے پیچھے کالو بھاگا اور کالو کے پیچھے لالو بھاگا اور لالو کے پیچھے لالی بھی گھر سے نکل آئی، لیکن وہ دروازے ہی میں رک گئی اور دانتوں میں انگلی ڈال کر یہ تماشا دیکھنے لگی۔

لومڑی سب سے تیز دوڑی۔ اس سے پیچھے کالو تھا اور لالو سب سے پھسڈی رہا۔ لومڑی کو کوئی نہ پکڑ سکا اور وہ گھنے جنگل میں جا چھپی۔ لومڑی کی جان بال بال بچی تھی۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ کافی دیر ہانپنے کے بعد اس نے دل میں سوچا، "افوہ، لالو کسان تو بہت ظالم ہے اور کالو کتا تو بہت زیادہ تیز دوڑتا ہے۔ اگر یہ میرا پیچھا نہ کرتے تو آج میں موٹی مرغی کو ضرور چٹ کر جاتی۔ پھر لومڑی نے ایک ترکیب سوچی اور ترکیب سوچ سوچ کر دل میں بہت خوش ہوئی۔

اگلے دن لومڑی نے لالو کسان کے گھر کا رُخ نہ کیا، بلکہ تمام دن ہڈیاں جمع کرتی رہی شام ہونے تک اس نے بہت سی ہڈیاں جمع کر لی تھیں۔ لومڑی نے دل میں کہا،



"اب میں ان ہڈیوں کو کسان کے گھر سے لے کر جنگل تک دور دور پھیلا دوں گی اور کالو میرا پیچھا کرنے کے بجائے ان ہڈیوں کو تلاش کرے گا۔"

لومڑی یہ ترکیب سوچنے کے بعد اس دن کا انتظار کرنے لگی جب ہوا کا رُخ جنگل کی طرف ہو۔ آخر ایک دن جنگل کی طرف ہوا چلنے لگی۔ درخت ہوا کے رُخ پر جھومنے لگے اور گھاس پھونس اور خشک پتے ہوا کے ساتھ اڑنے لگے۔

ہوا بہت زور کی تھی۔ لالی نے دل میں سوچا کیوں نہ آج لالو کے تمام پاجامے اور قمیضیں دھوکر ہوا میں سکھا لوں۔ لالی نے ایسا ہی کیا اور کپڑے دھو دھوکر گھر سے باہر میدان میں رسی تان کر پھیلا دیے۔

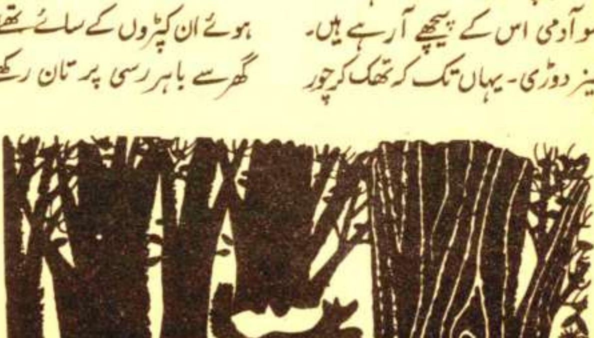
ادھر لومڑی نے بھی اپنا کام کیا اور جنگل سے لے کر کسان کے گھر تک بہت سی ہڈیاں بکھیر دیں۔ پھر وہ جنگل کے ایک سرے پر بیٹھ کر کالو کا انتظار کرنے لگی۔ کالو کی ناک بہت تیز تھی، اسے پتہ چل گیا کہ گھر کے پاس بہت سی ہڈیاں پڑی ہیں۔ کالو کی بھوک چمک اٹھی اور رال ٹپکنے لگی۔ آخر وہ گھر سے باہر نکلا اور ہوا کو سونگھتا ہوا جنگل میں دور بہت دور چلا گیا۔ اب لومڑی اپنے جی میں بہت خوش ہوئی، لالو کسان کے گھر پہنچی۔

لومڑی نے دیکھا کہ ڈربے کی چھت پر وہی مرغا سینا تانے اذان دے رہا ہے اور لالو کسان کی سب سے موٹی مرغی دانے کی تلاش میں ڈربے سے باہر گھوم رہی ہے۔

لالو کسان سو رہا تھا۔ لالی کھانا پکانے کے لیے باورچی خانے میں چلی گئی تھی اور کالو کتے کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔

لومڑی دبے پاؤں گھر کے اور قریب پہنچ گئی۔ اچانک اسے زمین پر بہت سی ٹانگیں اور بازو حرکت کرتے ہوئے نظر آئے لومڑی کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے سوچا، "افوہ، یہاں تو آج سینکڑوں آدمی ہیں اور یہ سب مجھے پکڑنا چاہتے ہیں۔" لومڑی نے پلٹ کر دیکھا وہاں بھی بہت سی ٹانگیں نظر آئیں۔ اب تو لومڑی کو بہت ہی ڈر لگا اس نے فوراً جنگل کی طرف رُخ کیا اور آنکھیں میچ کر دوڑنے لگی۔ لومڑی دوڑتے دوڑتے آدھا جنگل پار کر گئی، لیکن وہ یہی سوچ رہی تھی کہ سو آدمی اس کے پیچھے آرہے ہیں۔ لومڑی اور تیز دوڑی۔ یہاں تک کہ تھک کر چور ہوگئی اور آخر بے دم ہوکر ایک جگہ بیٹھ گئی۔ لومڑی نے اگلے دن دل میں سوچا، "افوہ، میری تو جان بچ گئی۔ سو آدمیوں نے لالو کسان کے گھر سے میرا پیچھا کیا، لیکن میں نے سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ خیر اب میں کبھی لالو کسان کی موٹی مرغی کھانے وہاں نہیں جاؤں گی۔"

لومڑی واقعی پھر کبھی لالو کسان کے گھر نہیں آئی۔ کالو کتّا یہ سمجھتا ہے کہ لومڑی اس کی خوفناک آواز سے ڈر کر بھاگ گئی اور لالو کسان یہ سوچتا ہے کہ لومڑی اس کی لاٹھی دیکھ کر بھاگ گئی، لیکن لالی کو یہ بات اب تک معلوم نہیں کہ لومڑی جن سو آدمیوں سے ڈر کر بھاگی تھی، وہ سو آدمی نہیں، بلکہ دُھلے ہوئے ان کپڑوں کے سائے تھے جو لالی نے دھو کر گھر سے باہر رسی پر تان رکھے تھے۔

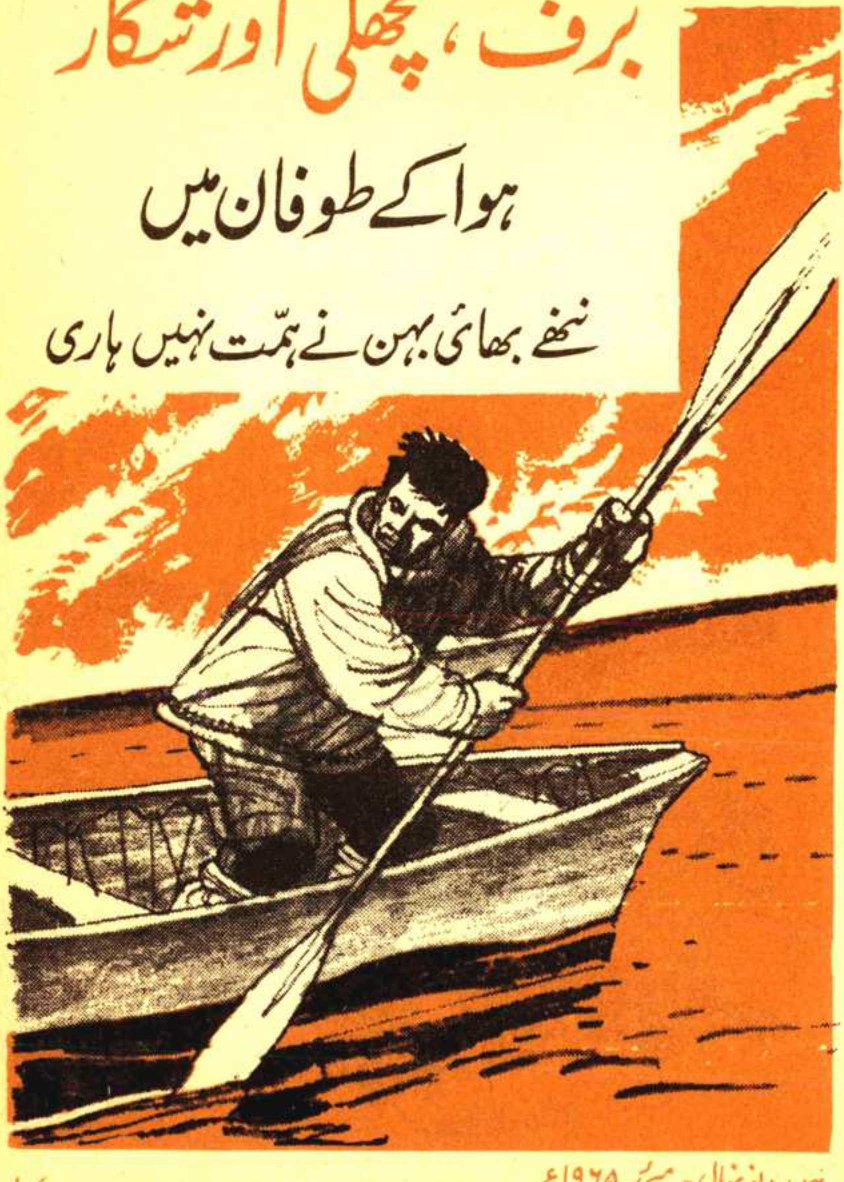


حبیب اللہ رشدی

برف، مچھلی اور شکار

ہوا کے طوفان میں

ننھے بھائی بہن نے ہمّت نہیں ہاری



الاسکا کے برفانی ملک میں بہار کا زمانہ آیا۔ سردی کے سارے موسم میں سورج نظر نہ آیا تھا، اب وہ نظر آنے لگا۔ سمندر کی سطح پر نیلی برف کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی، اب اس پر کہیں کہیں پانی کے چشمے نظر آنے لگے۔

الاسکا کے ایک گاؤں میں پوستین پہنے ہوئے مردوں عورتوں اور بچوں میں بڑی ہماہمی پیدا ہوگئی۔ کتا گاڑیوں پر سفر کا سامان لادا جانے لگا۔ اس گاؤں میں رہنے والی اسکیمو قوم کا ہر ہر آدمی گھر کے باہر کسی نہ کسی کام میں مشغول ہوگیا۔ یہ زمانہ وھیل مچھلیوں کے شکار کا ہے، جس کا گوشت سارے گاؤں والوں کی مستقل غذا ہے۔ اس موسم میں سمندر پر برف کی موٹی تہہ میں شگاف پڑ جاتے ہیں اور وھیل مچھلیاں ان شگافوں میں سے راستہ نکال کر بحر شمالی کی طرف جاتی ہیں۔

کُونک کا باپ چمڑے کی چپٹی کشتی کو ٹھیک ٹھاک کرنے لگا۔ کُونک کئی ہفتوں سے کشتی کو صاف کرنے اور وھیل کے شکار کے برچھے کو تیز کرنے میں باپ کا



وھیل مچھلیاں آنے لگیں تو بندوقیں چلنا شروع ہوگئیں

ہاتھ بٹاتا رہا۔ اب اس کی عمر بارہ برس کی ہو چکی تھی، مگر وہ ایک جوان آدمی کی طرح باپ کے ساتھ شکار کی تیاری کرتا رہا۔ کُونک کی بہن سارہ نے اپنے باپ کے لیے جوتوں کا ایک نیا جوڑا سی دیا تھا

کونک کئی روز سے سمندر کو غور سے دیکھتا رہا تھا کہ برف میں کوئی دڑاڑ پڑی یا نہیں۔ آخر ایک روز ایک بڑا شگاف نظر آیا۔ برف کی بڑی بڑی چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر علیحدہ ہو رہی تھیں، اگرچہ ساحل سے ملی ہوئی برف کی پپڑی ابھی تک جوں کی توں تھی۔

برف کی تہہ پر شگاف پڑتے دیکھتے ہی کشتی تیار کر لی گئی۔ سارہ نے سفری صندوق باپ کے حوالے کیا، جس کو اس نے اپنے چھوٹے سے خیمے اور شب خوابی کے فرغلوں کے ساتھ باندھ کر کتا گاڑی میں جما دیا۔ سارہ بڑی خوش تھی، کیوں کہ اس سال وہ بھی باپ اور بھائی کے ساتھ وھیل کے شکار پر جا رہی تھی۔ جب گاڑی میں کتوں کو جوتا جانے لگا تو کُونک نے دیکھا کہ اس کا باپ دوسرے کتوں کے ساتھ بوڑھی کتیا ٹُوٹُو کو بھی باندھ رہا ہے۔ اس نے باپ سے کہا، "یہ بوڑھی کتیا تیز نہیں چل سکتی، اس کو گاڑی میں نہ جوتا جائے۔" باپ کو کُونک کی یہ جسارت پسند نہیں آئی، اس نے کہا،

"یہ کتیا بوڑھی تو ہے، مگر بڑی ہوشیار ہے۔ کئی سال سے ہم اس کو شکار پر لے جا رہے ہیں۔ اس سال اس کو یہاں کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔"

سارہ نے کتیا کا سر تھپکتے ہوئے کہا، "یہ بالکل صحیح ہے ہم ٹُوٹُو کے بغیر نہیں جا سکتے۔"

کُونک نے کوئی جواب نہیں دیا، لیکن دل ہی دل میں تاؤ کھاتا رہا۔

گاؤں والوں کی تمام ٹیمیں تیار ہو گئیں اور بڑے شور و غل کے ساتھ وہ لوگ سمندر کی طرف روانہ ہوئے، جہاں برف کی دڑاڑ میں سے پانی کے بخارات اٹھ رہے تھے۔ کونک اور سارہ اپنے باپ کے ساتھ کتا گاڑی کے پہلو میں خوش خوش چلنے لگے۔ سارہ سوچ رہی تھی کہ جب سمندر کے کنارے ان کا چھوٹا سا خیمہ لگ جائے گا تو وہ چھوٹے چھوٹے کیک تیار کرے گی۔ کونک بڑی بڑی وھیلوں اور اپنے نئے برچھے کے خیال میں محو تھا۔ یہ لوگ اپنے اپنے خیالوں میں ایسے مگن تھے کہ اس طرف توجہ ہی نہ کر سکے کہ ان کی کتا گاڑی کی رفتار بہت



شکاریوں نے زیادہ آرام نہیں کیا۔ جیسے ہی صبح کے آثار ہوئے، وہ دوبارہ چل پڑے۔

دھیمی ہوچکی تھی۔ دوسرے لوگ ان سے بہت آگے نکل چکے تھے۔

یکایک باپ نے چلاّ کر کتّوں کو ٹھیرادیا۔ بوڑھی کتیا ٹوٹو بری طرح لنگڑا رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر کتیا کے پاس گیا اور اس کے پاؤں کو اچھی طرح دیکھ بھال کر کہا، "ٹوٹو کے پاؤں میں سوجن آگئی ہے، ہمیں بہت آہستہ آہستہ چلنا چاہیئے۔"

"غریب کتیا!" سارہ نے کہا۔

مگر کونک نے ایک لفظ نہیں کہا، کیوں کہ اس کو غصّہ بھی تھا اور شرمندگی بھی تھی۔ گاؤں والے اب اُن کی آنکھوں سے تقریباً اوجھل ہوچکے تھے۔

خدا خدا کر کے جب وہ برف کے کنارے پہنچے تو دیکھا کہ وہاں کئی خیمے لگ چکے تھے۔ ان خیموں میں عورتوں اور بچّوں کے علاوہ کوئی مرد موجود نہیں تھا۔ سب کے سب مرد شکار کے لیے جا چکے تھے اور سمندر کے پانی میں دور دکھائی دے رہے تھے۔ بندوقوں کی آوازیں آنے لگیں، جس کا مطلب یہ تھا کہ وھیل مچھلیاں آنے لگی ہیں۔

کونک اور اس کے باپ نے جلد جلد کتّوں کو کھول دیا۔ کتّا گاڑی سے سامان اتارا اور ننھی سارہ کے لیے خیمہ نصب کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے جلد جلد شکار کے ہتھیار نکالے، اپنی کشتی کو پانی میں ڈال دیا اور جلد جلد چپّو چلانے لگے تاکہ شکار میں حصّہ لے سکیں۔

کونک اپنا غصّہ بھول گیا۔ پانی پر برف کے بڑے بڑے تختے تیرتے پھر رہے تھے۔ یکایک ایک بڑی وھیل شکاریوں کے نرغے سے نکل کر ان برف کی تختوں کے



وہ تیزی کے ساتھ برف کے کنارے کی جانب بڑھنے لگے۔

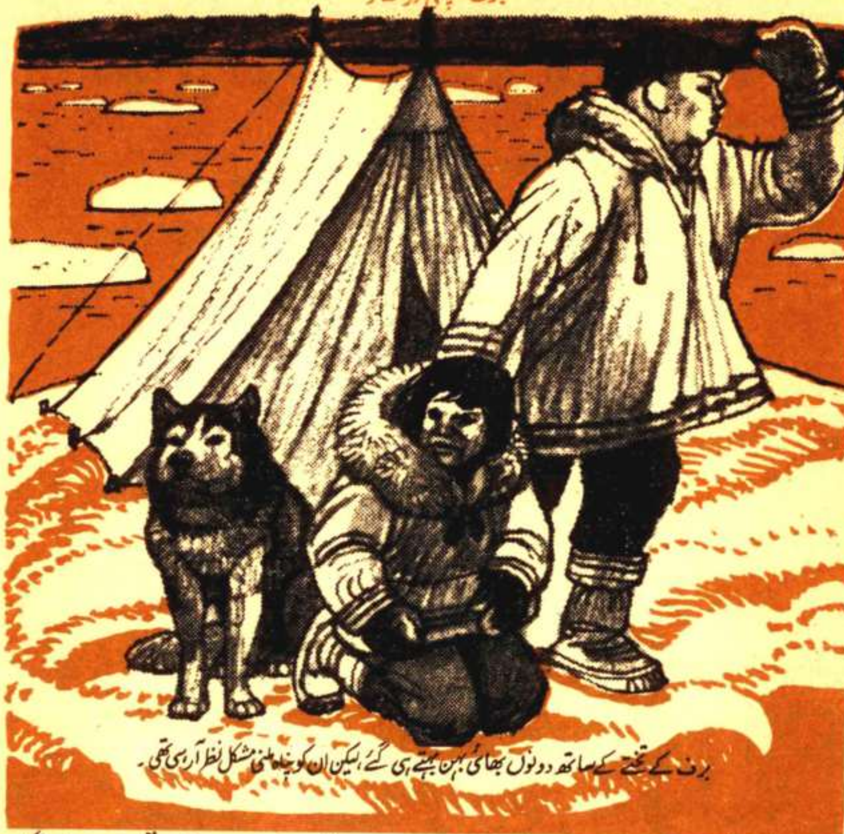
درمیان نظر آئی۔ کشتیوں میں جو لوگ پھیلے ہوئے تھے، انھوں نے اپنی بندوقیں داغ دیں۔ جب یہ باپ بیٹے ذرا اور نزدیک گئے تو دیکھا کہ اگر وھیل پر برچھا نہیں مارا جائے گا تو وہ صاف بچ نکلے گی۔ انھوں نے فوراً چپو ڈال دیے اور برچھے اٹھالیے اور سیدھے کھڑے ہو گئے۔ کشتی بہتی چلی جاتی تھی۔

یکایک وھیل کا رُخ بدلا اور وہ سیدھی ان کی کشتی کی طرف آنے لگی۔ اب انھیں یہ خوف ہونے لگا کہ وھیل اگر کشتی کے قریب آگئی تو کشتی الٹ جائے گی اور وہ پانی میں گر پڑیں گے۔ کُونگ کے باپ نے اپنا برچھا ڈال دیا اور چپو اٹھا کر کشتی کو وھیل کے راستے سے ہٹانے لگا۔

خوش قسمتی سے عین وقت پر کشتی مڑ گئی اور وھیل آپہنچی۔ کونگ نے بڑی پھرتی سے اپنا برچھا وھیل پر پھینک مارا۔ برچھا وھیل کے بدن میں دھنس گیا۔ برچھے کے ساتھ جو ڈورا بندھا ہوا تھا اس کو کُونگ نے مضبوطی سے تھام لیا، لیکن وھیل کی رفتار اور وزن سے کشتی ایک طرف جھک گئی اور پانی اچھل اچھل کر ان دونوں کو بھگونے لگا۔

فوراً ہی دوسرے شکاریوں کی کشتیاں بھی آپہنچیں اور کئی شکاریوں نے اپنے اپنے برچھے پھینک مارے اور گولیاں چلائیں۔ ہر طرف شور ہو رہا تھا اور بڑی ہل چل مچی ہوئی تھی۔ وھیل کو مار لیا گیا۔ اب شکار ختم ہوگیا۔ یہ اس موسم کی پہلی وھیل تھی، جس پر کونگ نے سب سے پہلے برچھا مارا تھا۔

دوسرے دن صبح سے ہوا تیز چلنے لگی۔ گُونگ کے باپ نے کہا کہ وہ شکار پر نہ چلے، کیوں کہ طوفانی ہوا سے سارہ کو یہ خوف ہو رہا تھا کہ کہیں خیمہ اکھڑ نہ جائے۔



برف کے تختے کے ساتھ دونوں بھائی بہن بہتے ہی گئے، لیکن ان کو جان بچنی مشکل نظر آ رہی تھی۔

ٹوٹو کتیا کی ٹانگ لنگڑی تھی، اس لیے اسے بھی خیمے میں چھوڑ کر باپ شکار پر روانہ ہو گیا۔ دن چڑھتے چڑھتے ہوا اور تیز ہونے لگی۔ جگہ جگہ سے برف کے تختے ٹوٹ ٹوٹ کر الگ الگ بہنے لگے۔ دوپہر ہو گئی، مگر شکاری واپس نہیں آئے۔ دوپہر کے بعد طوفان کی تیزی سے خیمہ جھولنے لگا اور ان کے نیچے برف کے تختے بھی ہلنے لگے۔ پھر ایک تڑاقا ہوا اور برف کا وہ تختہ جس پر ان کا خیمہ نصب تھا، ٹوٹ کر پانی میں بہنے لگا۔ دونوں بھائی بہنوں نے باہر دیکھا تو سخت خوف زدہ ہو گئے۔ برف کا تختہ جس پر ان کا خیمہ تھا، اصل کیمپ سے بہت دور نکل چکا تھا اور بہتا ہی چلا جاتا

تھا۔ یہ دیکھ کر سارہ رونے لگی۔

گُونک نے کہا، "ہمیں بہادر بننا چاہیے۔ کیمپ والے ہمارے لیے کشتی ضرور بھیجیں گے"۔ یہ بات کہنے کو تو گُونک نے کہہ دی، مگر وہ خود دل میں ڈرا ہوا تھا، کیوں کہ کیمپ میں تو ایک کشتی بھی باقی نہیں تھی۔

مایوسی کے عالم میں گُونک نے ہر چیز پر نظر ڈالی۔ برف کے اس تختے پر ان کے خیمے میں شب خوابی کے فَرغُل تھے۔ ایک مختصر ذخیرہ کھانے کی چیزوں کا تھا اور کچھ متفرق سامان تھا اور لوٹوکتیا دم ہلاتی بیٹھی ہوئی تھی۔

برف کا یہ تختہ کئی گھنٹے تک بہتا رہا۔ طوفانی ہوا کم ہوگئی، مگر اب بہت سرد ہو چکی تھی۔ دور ساحل پر برف کی سفید لکیر نظر آرہی تھی اور اس کے پیچھے پہاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ انھوں نے خاموشی سے تھوڑا سا کھانا زہر مار کیا۔ سارہ کتیا کو خیمے کے اندر لے آئی اور دونوں سوچنے لگے کہ ان کا کیا حشر ہوگا۔ وقت گزرتا گیا، مگر کیمپ سے امداد پہنچنے کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔

سورج ڈوب گیا، رات ہو گئی۔ یہ دونوں بے سدھ پڑے رہے۔ دوسری صبح کو ہوا میں سردی اور بڑھ گئی۔ ایک مرتبہ ان کا یہ تختہ بہتا ہوا زمین کے قریب پہنچ گیا، مگر پھر ہوا کے جھونکوں سے دور ہوگیا۔ پھر شام ہوگئی۔ اب کوئی غذا باقی نہیں رہی تھی۔ یہ دونوں بھوکے سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے سو رہے۔ صبح ہی صبح گُونک کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ لوگ اب کہاں ہیں۔

گُونک نے دیکھا کہ لوٹوکتیا برف کے کنارے کھڑی مچل رہی ہے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ سمندر کی سطح پر برف کی ایک نئی تہہ جم گئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ کتیا برف کے تختے سے نیچے اتر کر تازہ جمی ہوئی برف پر تھوڑی دور چلی گئی۔ وہاں سے وہ پلٹ کر گُونک کی طرف دیکھنے لگی، جیسے کہہ رہی ہو کہ تم بھی میرے پیچھے چلے آؤ۔

گونک سوچنے لگا کہ یہ نئی برف کی تہہ اتنی موٹی ہے بھی یا نہیں کہ اس کا وزن اٹھا سکے۔ ممکن ہے کہیں یہ پپڑی پتلی ہو اور اس کے وزن سے ٹوٹ جائے۔ پھر اس نے خیال کیا کہ کتیا کی رہبری میں نکل چلنا ہی مناسب ہوگا۔ اس نے بہن

کو جگایا۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی، مگر بھائی کے مشورے پر وہ بھی چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔

یہ دونوں بڑی احتیاط سے چاروں ہاتھ پاؤں کے بل پر جانوروں کی طرح ٹوٹو کتیا کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ یہ تازہ برف ربر کی چادر کی طرح تھی، ان کے وزن سے دب دب جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کو ڈر ہوتا تھا کہ کہیں یہ پپڑی ٹوٹ نہ جائے۔ کتیا بار بار برف کو سونگھتی جاتی تھی اور بار بار بدلتی جاتی تھی۔

یہ لوگ چلتے گئے۔ کونک کو وقت کا خیال نہیں رہا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اتنے سرد ہو چکے تھے کہ ان کو حرکت دینا مشکل تھا۔ سارہ رونے لگی پھر بھی وہ چلتے گئے۔

یکایک کونک کے کانوں میں آوازیں آنے لگیں۔ وہ یہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ جاگ رہا ہے یا خواب دیکھ رہا ہے۔ اس نے آوازوں کی سمت نظر دوڑائی دیکھا کہ وہ اب ایک چٹان پر ہے۔ آخر وہ دونوں زمین پر آ ہی گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے دیکھا کہ اس کا باپ اور دوسرے شکاری ان دونوں کی مدد کے لیے آ رہے ہیں۔

" ٹوٹو ہمیں یہاں تک حفاظت کے ساتھ لے آئی، یہ واقعی بڑی سمجھ دار کتیا ہے"۔ کونک نے آہستہ سے کہا، " ہاں ہاں وہ بہت ہوشیار کتیا ہے!" باپ نے کہا، " ہم دن رات تم لوگوں کو تلاش کرتے رہے۔ اس کتیا کی چیخوں کی آواز سن کر ہم لوگ ادھر چلے آئے۔ بہت سی وھیل مچھلیاں پکڑی گئی ہیں، ہم اب جلدی سے گاؤں کو واپس جائیں گے"۔

دوسرے شکاریوں نے کہا، " اب دعوت کا سلسلہ شروع کر دینا چاہیے"

اچھی باتیں

ملک خالد جاوید۔ کوئٹہ

- اگر لڑنا چاہتے ہو تو اسلام کی خاطر لڑو۔
- اگر مرنا چاہتے ہو تو شہیدوں کی موت مرو۔
- اگر پینا چاہتے ہو تو غصہ پیو۔
- اگر کرنا چاہتے ہو تو بھلائی کرو۔
- اگر بولنا چاہتے ہو تو سچ بولو۔
- اگر بیٹھنا چاہتے ہو تو تہذیب سے بیٹھو۔

یہ کراچی ہے!

خالد خلیل نعمانی

یہ پاکستان کا سب سے بڑا اور خوب صورت شہر تیس لاکھ باشندوں اور پینتیس مربع میل کے رقبے میں پھیلے ہوئے اس شہر کا نام کراچی ہے۔

آؤ! آج ہم تمھیں کراچی کی سیر کرائیں۔ تم میں سے بہت سے نونہال ایسے ہوں گے، جنھوں نے کراچی شہر دیکھا ہوگا، اس کی سیر بھی کی ہوگی اور بہت سے نونہال ایسے بھی ہوں گے، جنھوں نے صرف کراچی کا نام ہی سُنا ہوگا یا کتابوں میں اس شہر کا نام پڑھا ہوگا۔

کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ رقبے کے لحاظ سے بھی اور آبادی کے لحاظ سے بھی، بلکہ صنعتی



ایمپرس مارکیٹ صدر

لحاظ سے بھی۔ کہتے ہیں کراچی میں پاکستان کی آدھی دولت ہے۔

کراچی ایک بین الاقوامی شہر ہے۔ یہاں ہر ملک کے باشندے ملیں گے۔ بہت سے ملکوں کے سفارت خانے بھی کراچی میں ہی ہیں۔ یہاں کا ہوائی اڈہ ایشیا کے بڑے ہوائی اڈوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہی حال کراچی کی بندرگاہ کا بھی ہے۔

کراچی امیروں، غریبوں سب کا شہر ہے۔ ایک طرف اونچے اونچے عالی شان مکان ہیں تو دوسری طرف چھوٹے چھوٹے کوارٹر اور جھگیاں بھی ہیں۔ یہاں صاف ستھرے علاقے بھی ہیں اور گندے اور تنگ و تاریک علاقے بھی۔ اب کراچی کو صاف



کراچی ائرپورٹ

کھارادر اور میٹھادر کے محلوں کے قریب نیو نہم روڈ پر وہ تاریخی مکان اب تک موجود ہے، جس میں پاکستان کے بانی قائداعظم محمد علی جناح پیدا ہوئے تھے۔ یہ مکان اب قومی یادگار بنا دیا گیا ہے۔ دنیا بھر سے جو لوگ کراچی آتے ہیں وہ اس مکان کو دیکھنے کے لیے ضرور جاتے ہیں۔

اب آؤ، کراچی کی سیر گاہوں کی طرف چلتے ہیں۔

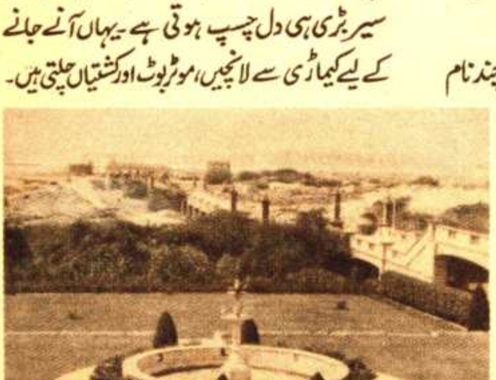
منوڑا: کیماڑی کی بندرگاہ سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس میں ایچ، ایم، پی، ایس "دلاور" کے نام سے ایک تربیتی ادارہ قائم ہے، جس کا کام پاکستان کی بحری فوج کے افسروں اور جوانوں کی تربیت ہے۔ یہاں ایک اور تربیتی ادارہ "ہمالیہ" بھی ہے۔ یہاں توپوں اور راڈرز سے کام لینا سکھایا جاتا ہے۔ یہاں کی سیر بڑی ہی دل چسپ ہوتی ہے۔ یہاں آنے جانے کے لیے کیماڑی سے لانچیں، موٹر بوٹ اور کشتیاں چلتی ہیں۔



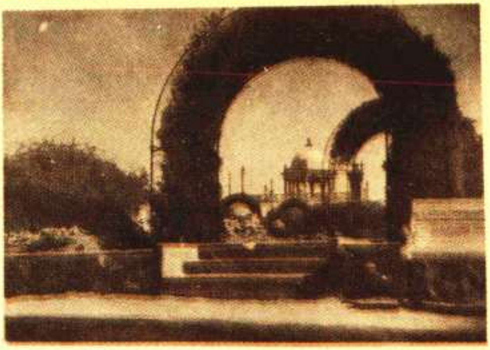
کیماڑی: پانی کے بڑے بڑے جہاز کھڑے ہیں

ستھرا بنانے کی کوششیں بڑی تیزی سے جاری ہیں۔ اسی لیے کراچی کو پھیلایا جا رہا ہے۔ اس کے آس پاس نئی نئی بستیاں بسائی جا رہی ہیں۔

کراچی کی مشہور بستیوں اور علاقوں کے چند نام یہ ہیں:۔ کورنگی، لانڈھی، ملیر، سعود آباد، ڈرگ کالونی، محمد علی ہاؤسنگ سوسائٹی، پی۔ ای سی۔ ایچ سوسائٹی، نیو کراچی، دستگیر سوسائٹی عزیز آباد، لیاقت آباد، ناظم آباد، گولی مار، پیر الٰہی بخش کالونی، سولجر بازار، رام سوامی، رنچھوڑ لائن، بنس روڈ، آرام باغ، کھارادر، میٹھادر، کھڈہ، لیاری، شیر شاہ، بلدیہ کالونی ان کے علاوہ اور بھی بے شمار محلے ہیں۔



کلفٹن کا ایک منظر



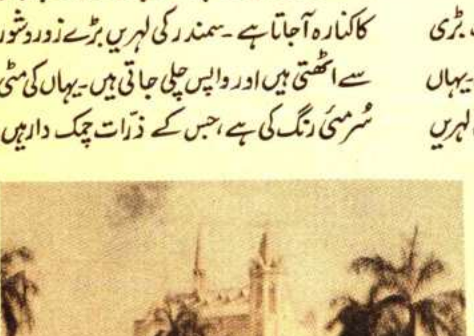
کلفٹن کا ایک اور منظر

تیل کے ذخیرے بھی ہیں۔ یہاں کی سیر کے لیے ٹکٹ لگا ہوا ہے۔

کلفٹن: یہ ایک ساحلی اور اچھی تفریح گاہ ہے۔ چھٹیوں اور تہواروں کے موقعوں پر بڑی تعداد میں لوگ آتے ہیں۔ یہ شہر سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ کلفٹن کا یہ ساحل بہت دُور تک چلا گیا ہے۔ ایک طرف تو حدِ نظر تک سمندر اور دوسری طرف اونچے نیچے ریت کے ٹیلے ہی ٹیلے ہیں۔ یہاں پر گھاس کے تختے اور خوش نما فوارے بھی ہیں اور ایک پُل بھی جو سمندر کی طرف کافی دُور تک چلا گیا ہے۔ پُل کے آخری حصے پر ایک بارہ دری بنی ہوئی ہے۔ اس بارہ دری کے بعد سمندر کا کنارہ آجاتا ہے۔ سمندر کی لہریں بڑے زور و شور سے اٹھتی ہیں اور واپس چلی جاتی ہیں۔ یہاں کی مٹی سُرمئی رنگ کی ہے، جس کے ذرّات چمک دار ہیں۔

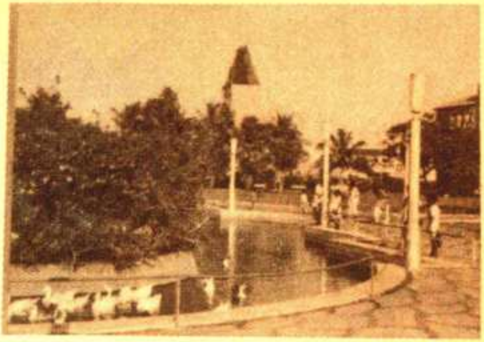
یہاں پر ایک بڑا قلعہ بھی ہے اور ایک ٹاور بھی۔ اس ٹاور کی روشنی دس میل دُور تک سے نظر آتی ہے۔ یہ ٹاور بحری جہازوں کی رہنمائی کرتا ہے اور اُن کو صحیح راستہ بتاتا ہے۔

چھٹیوں، تہواروں کے موقع پر لوگ بڑی تعداد میں یہاں سیر و تفریح کے لیے آتے ہیں۔ یہاں وہ منظر قابلِ دید ہے جب سمندر کی بڑی بڑی لہریں اوپر نیچے اُٹھتی ہوئی ساحل تک آتی ہیں اور پھر واپس ہو جاتی ہیں۔ ان لہروں میں بہت سے لوگ نہاتے اور لطف اُٹھاتے ہیں۔



باغ جناح (سابق فریرہال)

کیماڑی: یہ کراچی کی بندرگاہ ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ ایک ایسٹ وھارف دوسرا ویسٹ وھارف۔ یہ جگہ بڑی مصروف ہے۔ دن بھر یہاں جہازوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ یہاں بڑے بڑے گودام اور



جہانگیر پارک

یہاں اگر نہالیا جائے تو مٹی کے ذرات چپک جاتے ہیں۔

عید، بقرا عید اور دوسرے تہواروں پر یہاں میلہ لگتا ہے اور خوب چہل پہل رہتی ہے۔

کلفٹن کے قریب ہی ایک بزرگ کا مزار بھی ہے، جہاں ہر جمعرات کو میلہ سا لگتا ہے اور لوگ زیارت کے لیے آتے ہیں۔

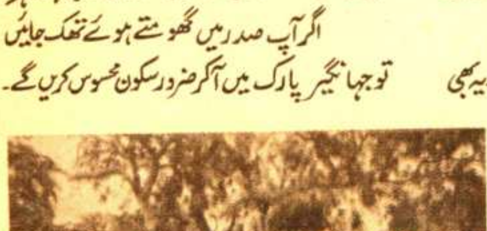
باغِ جناح : اس کا پُرانا نام فریرھال ہے۔ یہ بھی ایک اچھی اور پُرسکون تفریح گاہ ہے۔ شام کو مرد، عورتیں اور بچے بڑی تعداد میں تفریح کے لیے آتے ہیں۔ اتوار کو تو یہاں بہت ہی ہجوم رہتا ہے۔ یہاں بچوں کے لیے علیحدہ پارک بھی ہے، جہاں جھولے وغیرہ لگے ہوئے ہیں۔

یہاں پر ایک عجائب گھر بھی ہے جس میں آثار قدیمہ کی کھدائی سے نکلنے والی مختلف قسم کی اشیا اور سونے چاندی اور پیتل کے مجسمے رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی نادر چیزیں ہیں۔

غیر ملکی معزز مہمانوں کو کراچی کے شہریوں کی طرف سے استقبالیے بھی یہیں دیے جاتے ہیں۔

جہانگیر پارک : یہ شہر کے بیچوں بیچ صدر کے علاقے میں ہے۔ یہاں چاروں طرف گھاس کے تختے اور رنگ برنگے پھول اور پودے ہیں۔ درمیان میں ایک تالاب ہے، جس میں سفید سفید خوب صورت بطخیں تیرتی پھرتی ہیں۔ تالاب کے بالکل درمیان میں پھولوں کے پودے لگے ہوئے ہیں۔ ان کی وجہ سے تالاب کی خوب صورتی دوبالا ہوگئی ہے۔

اگر آپ صدر میں گھومتے ہوئے تھک جائیں تو جہانگیر پارک میں آکر ضرور سکون محسوس کریں گے۔



چڑیا گھر (سابق گاندھی گارڈن)



اسٹیٹ بنک آف پاکستان

پانی کے چشموں کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہاں پر ایک بڑا تالاب ہے، جس میں بڑے بڑے مگرمچھ پڑے رہتے ہیں۔

ان کے علاوہ ہاکس بے، سینڈس پٹ حب ندی، بندمراد خاں اور ملیر کے باغات بھی تفریح کے لیے بڑی اچھی جگہیں ہیں۔

کراچی اونچی، بڑی اور شان دار عمارتوں کا شہر ہے، جن میں اسٹیٹ بنک آف پاکستان، نیشنل بنک آف پاکستان، قمر ہاؤس، کراچی پولس ہیڈ آفس، حبیب اسکوائر، محمدی ہاؤس، کراچی انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل، ہوٹل میٹروپول، سنٹرل ہوٹل، پی آئی۔ ڈی سی بلڈنگ



محمدی ہاؤس

چڑیا گھر: یہ چڑیا گھر جس کا پرانا نام گاندھی گارڈن تھا، وسیع رقبے میں بنایا گیا ہے۔ اس میں آپ کو چھوٹے، بڑے، خشکی پانی کے تقریباً سب ہی جانور ملیں گے۔ مثلاً ہاتھی، زرافے، زیبرا، شیر، چیتا، تیندوا، بھیڑیا، گیدڑ، لومڑی، بندر، ریچھ، مگرمچھ اور کئی قسم کے جانور... اگر بندر منھ چڑائیں تو بُرا مت ماننا، بلکہ تمھارے پاس اُن کے کھانے کی کوئی چیز ہو تو وہ پنجرے سے دُور رہ کر ڈال دو۔

اگر تمھیں ہاتھی کی سواری کا شوق ہے تو ہاتھی کی سواری کرو اور لطف اُٹھاؤ۔

منگھا پیر: منگھا پیر کراچی سے شمال مغرب کی جانب تقریباً دس میل کے فاصلے پر چھوٹے چھوٹے پہاڑوں کے درمیان میں واقع ہے۔ یہاں ایک بزرگ کا مزار ہے۔ یہ جگہ اسی مزار اور دو گرم



کراچی ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل

کراچی میونسپل کارپوریشن بلڈنگ، نیشنل اسمبلی بلڈنگ، چیف کورٹ بلڈنگ، ہمدرد دواخانہ ناظم آباد، آغاخاں جماعت خانہ کھارادر کی بلڈنگ، کراچی آرٹس کونسل ہال، نیو ٹاؤن جامع مسجد، میمن مسجد وغیرہ وغیرہ دیکھنے کی عمارتیں ہیں۔ ان عمارتوں کو دیکھ کر کراچی پر پاکستان کا نیویارک ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔

ان عمارتوں کے علاوہ کراچی کے بازار بھی ایسے ہیں کہ آپ دیکھیں تو دیکھتے ہی رہ جائیں۔ خصوصاً رات کے وقت جب دکانوں کے بورڈ اور اشتہاری بورڈ رنگ برنگے سائن میں چمکتے ہیں تو عجیب منظر ہوتا ہے۔ مثلاً انفسٹن اسٹریٹ، وکٹوریہ روڈ بوہری بازار، بندر روڈ پر جامع کلاتھ اور ڈینسو ہال کا حصہ اور ناظم آباد چورنگی سبیل والی مسجد (گرد و نواح)، پرانی نمائش سے بندر روڈ اور سوسائٹی کا کمرشل ایریا۔

ان بازاروں میں چھوٹی اور بڑی سب طرح کی دکانیں نظر آئیں گی، جہاں آپ کو زندگی کی ضرورت کی ہر چیز مل جائے گی۔

اب آخر میں کراچی کی مشہور سڑکوں کے نام بھی سُن لیجیے اور اپنی سیر ختم کیجیے:۔ بندر روڈ، فریر روڈ، میکلوڈ روڈ، لارنس روڈ، محمد علی جناح روڈ، وکٹوریہ روڈ، کلیٹن روڈ، شاہراہ عراق، شاہراہ ایران، شہید ملت روڈ، گارڈن روڈ۔



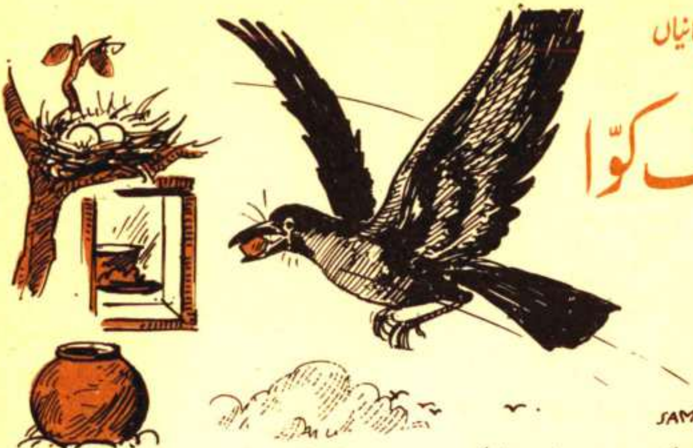
ہوٹل میٹروپول



کراچی میونسپل کارپوریشن

جانوروں کی کہانیاں

چالاک کوّا



تم نے کسی کتاب میں پڑھا ہوگا کہ ایک پیاسے کوّے نے ایک جگہ ایک پانی کا گھڑا پڑا دیکھ کر اس میں پانی پینا چاہا، لیکن پانی گھڑے کی تہہ میں اس قدر نیچے تھا کہ وہاں تک کوّے کی چونچ نہیں پہنچ سکتی تھی۔ تب اس نے پانی پینے کی ایک ترکیب سوچی۔ وہ چونچ سے ایک ایک کنکر لاکر گھڑے میں ڈالنے لگا۔ جوں جوں گھڑے کے اندر کنکر جمع ہونے لگے، پانی اوپر کو اٹھنے لگا۔ آخر جب پانی گھڑے کے گلے تک آگیا تو کوّے نے اچھی طرح پانی پی کر اپنی پیاس بجھائی۔

ایک انگریزی زبان کی کتاب میں افریقہ کے ایک کوّے کی ہشیاری کا قصہ لکھا ہے۔ کوّے نے ایک افریقی پرندے کھیڑ کے انڈے کھانے کی ایک اچھی ترکیب ڈھونڈ نکالی تھی۔ وہ پتھر کا ایک ٹکڑا لے کر اڑ جاتا اور اوپر سے ٹھیک نشانہ لگا کر انڈے کے اوپر گرا دیتا تھا۔ پتھر کی چوٹ سے انڈا پھوٹ کر نیچے گر جاتا اور وہ اس کے ٹکڑے کھا کھا کر اپنے پیٹ کی آگ بجھاتا تھا۔

کھیڑ کا انڈا اس قدر سخت ہوتا ہے کہ کوّے کی طاقت نہیں جو چونچ سے ٹھونگ مار کر اسے پھوڑ سکے۔ اس کو پھوڑنے کے لیے پتھر سے چوٹ لگانا ضروری ہے۔ اس پر اوپر سے پتھر چھوڑ دینے سے کام بن سکتا ہے اور کتنے اونچے سے پتھر گرانے سے انڈا پھوٹ سکتا ہے۔ کوّے کو ان تمام باتوں کا علم تھا۔ یہ ضرور ماننا پڑے گا۔ کوّے کی یہ عقل مندی

معمولی عقل مندی نہیں کہی جاسکتی اور یہ صاف طور سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسرے کوّے کی عقل میں اور اس کوّے کی عقل میں فرق تھا۔

اسی طرح پرانے زمانے میں دہلی کے ایک مکان میں بہت سے کوّے ہر روز آیا کرتے تھے۔ان میں ایک کوّا بار بار وہاں آتا جاتا رہتا تھا، اس لیے وہ اس گھر کے ہر آدمی کو پہچانتا تھا۔ وہ ان لوگوں سے اس قدر ہل مل گیا کہ بھگانے سے بھی جلدی نہیں بھاگتا تھا۔ اگر صحن میں مچھلیاں رکھی ہوتیں تو وہ انھیں چونچ میں لے کر اڑ جاتا۔ کمرے کے اندر گھس کر کھانے کی چیزوں میں منھ ڈال دیتا اور جب کسی کو ڈھیلے یا لکڑی سے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتے دیکھتا تو فوراً اڑ جاتا،لیکن خالی ہاتھ اٹھا کر اسے جلدی سے کوئی نہیں بھگا سکتا تھا۔

بعد میں اس کو بھگانے کی ایک اور ترکیب نکالی گئی۔ دھوپ میں آئینہ دکھانے سے جو روشنی نکلتی ہے، کوّے کو اڑانے کے لیے وہ اس کے بدن پر ڈالی جانے لگی۔ وہ اس روشنی سے ڈر کر فوراً اڑ جاتا تھا۔اس کے بعد اس کے آنے پر آئینہ دھوپ میں لے جانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔جوں ہی کسی کے ہاتھ میں آئینہ دیکھتا،وہ فوراً اڑجاتا تھا۔ وہ سمجھ جاتا تھا کہ آئینہ دھوپ میں رکھا جائے گا۔

اس کے بعد وہ دھوپ نکلنے سے پہلے اور دھوپ چلے جانے کے بعد آنے جانے لگا، لیکن اس وقت اسے ایسی کوئی چیز پڑی نہیں ملتی تھی،جسے وہ کھا سکے، اس لیے چند روز بعد اس نے صبح شام کا آنا جانا بھی ترک کردیا، اور دوسرے کوّوں کے ساتھ ہی آنے جانے لگا۔ مچھلی کے پر، دم اور بچے کھچے دال چاول اور ترکاری، روٹی وغیرہ جو کچھ پڑا ملتا، اسے بے خوف ہوکر اپنی ذات برادری والوں کے ساتھ مل کر کھا لیتا، کیوں کہ وہ کوّے یہ خوب سمجھتے تھے کہ یہ تمام چیزیں ہمارے ہی کھانے کے لیے ہیں، لیکن ہمارے دوست کوّے کی نگاہ ہمیشہ اُن چیزوں پر رہتی تھی،جن کو وہ چونچ ڈال کر خراب کر دیتا تھا اور چوں کہ وہ اس کے منھ ڈال دینے سے گھر والوں کے کھانے کے لائق نہیں رہتی تھیں، اس لیے پھینک دی جاتی تھیں۔ شاید وہ کوّا یہ سب باتیں سمجھتا تھا۔

دیکھا تم نے بچّو! کوّا کتنا چالاک جانور ہوتا ہے۔



امیر تیمور

میرزا ادیب

تم نے امیر تیمور کا نام ضرور سُنا ہوگا، ایک بہت بہادر جرنیل اور بادشاہ تھا۔ بڑے بڑے بادشاہ اس کا نام سُن کر ہی کانپ جاتے تھے۔ جہاں بھی حملہ کرتا تھا، فتح کیے بغیر نہیں لوٹتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا بچّو! کہ اس زبردست جرنیل نے تُرکوں پر حملہ کردیا، اس وقت جو بادشاہ تُرکوں پر حکومت کرتا تھا، اُس کا نام تھا بایزید۔ بادشاہ بایزید نے بڑی ہمت سے تیمور کا مقابلہ کیا، مگر اپنے دشمن کو نہ روک سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیمور برابر آگے بڑھتا گیا اور فتح پر فتح حاصل کرتا چلا گیا۔ اس نے ہزاروں ترکوں کو غلام بنا لیا۔ ان ترکوں میں ایک نوجوان بھی تھا، جو اگرچہ قیدی بن چکا تھا، لیکن مایوس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تیمور کے سپاہی اُسے دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے تھے کہ یہ کیسا باہمت شخص ہے کہ ایسے موقعے پر بھی ہمت نہیں ہارتا۔ جس خیمے میں اسے قید کیا گیا تھا، اس کے اِرد گرد کئی سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ خیمے کے اندر بھی ایک سپاہی موجود تھا۔ نوجوان نے اُس سپاہی سے کہا،

"میرے اچھے بھائی! میں امیر تیمور سے ملنا چاہتا ہوں۔ اگر تم مجھے اس کے پاس لے چلو تو یہ تمھاری بڑی مہربانی ہوگی اور میں یہ احسان کبھی نہیں بھُولوں گا۔"

سپاہی بولا، "نہ بابا! میں امیر کے پاس ہرگز نہیں جاؤں گا۔ قیدیوں کو اُن کے سامنے جانے کا حکم نہیں ہے۔" کوئی اور ہوتا تو یہ جواب سُن کر خاموش ہو جاتا، مگر وہ نوجوان تو نا اُمید ہونا جانتا ہی نہیں تھا۔ اُس نے دوسری بار سپاہی سے درخواست کی اور اس طرح کی کہ سپاہی کہنے لگا، "میں خود امیر کی خدمت میں نہیں جاتا، اُن کے ایک خاص افسر سے بات کرتا ہوں، اگر اُس نے

اجازت دے دی تو میں تمھیں لے چلوں گا، ورنہ تمھاری قسمت۔" سپاہی دل کا نیک تھا۔ اُس نے ایک افسر کو یہ بات بتائی اور افسر نے امیر تیمور سے کہا کہ" ایک ترک نوجوان آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔ اجازت ہو تو اُسے آپ کے خیمے میں پہنچا دیا جائے، ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" امیر تیمور نے سوچا، پتہ نہیں یہ قیدی مجھ سے کیا کہنا چاہتا ہے۔ بولا "بہت اچھا، کل اسے ہمارے دربار میں حاضر کردو۔ ہم خود پوچھیں گے کہ کیا کہنا چاہتا ہے اور کیوں ہم سے ملنے کا آرزو مند ہے؟"

دوسری صبح کئی سپاہی نوجوان کو اپنے گھیرے میں لے کر امیر تیمور کے سامنے پہنچے۔ اس وقت اُس کے پاس سب بڑے بڑے فوجی افسر بڑے ادب سے کھڑے تھے۔ اُن کی آنکھیں جُھکی ہوئی تھیں۔ کسی کی یہ مجال نہیں تھی کہ امیر تیمور کو آنکھ اُٹھا کر دیکھ سکے اور اس سے کوئی بات کر سکے۔

جب سپاہی نوجوان کو امیر تیمور کی خدمت میں لائے تو سب کا خیال تھا کہ وہ دہشت زدہ ہو کر اُس کے سامنے آئے گا، مگر وہ تو اس انداز سے اس کے سامنے گیا، جیسے اُس کے دل میں کوئی خوف اور خطرے کا خیال ہی نہیں ہے۔

امیر تیمور نے ایسا نڈر اور بہادر نوجوان پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اُسے اس طرح بے خوف و خطر دیکھ کر تیمور کو بڑا غصّہ آیا۔ بولا، "کہو کیا کہنا چاہتے ہو ہم سے؟"

نوجوان بولا، "جناب! میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے حاضر ہونے کی اجازت دی۔ میں ایک ترک نوجوان ہوں۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ میری قوم نے آپ کا کیا بگاڑا تھا کہ آپ نے اُس پر حملہ کر دیا اور اس کے ہزاروں سپاہیوں کو غلام بنالیا۔"

تیمور کے درباریوں کے چہرے غصّے سے سُرخ ہو گئے۔ خود تیمور کی بھی یہ حالت تھی کہ اُس کا ہاتھ تلوار پر جا پڑا تھا اور دیکھنے والوں کو اُمید تھی کہ وہ ابھی تلوار میان سے باہر نکال لے گا اور نوجوان کو مار ڈالے گا، لیکن جو شخص خود بہادر ہوتا ہے، وہ بہادر دشمن کی بھی قدر کرتا ہے۔ چُناں چہ تیمور نے اپنا ہاتھ تلوار سے ہٹا لیا اور کہنے لگا۔

"تم بہت گستاخ معلوم ہوتے ہو۔ جانتے ہو کس کے سامنے کھڑے ہو؟"

نوجوان بولا،

"خوب جانتا ہوں۔ میں ایک ایسے شخص کے سامنے کھڑا ہوں، جو بے رحم ہے اور دوسروں

کو لوٹنے کے سوا اور کوئی کام نہیں جانتا۔"

یہ الفاظ سُن کر تیمور کے سپاہیوں نے تلواریں کھینچ لیں اور اپنے مالک کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔ تیمور نے اُنھیں روک دیا اور نوجوان سے گرج کر بولا،

"نوجوان! تم پاگل ہو گئے ہو، مگر ہم تمھیں اجازت دیتے ہیں کہ اگر کچھ اور کہنا ہے تو وہ بھی کہہ لو، تاکہ تمھارے دل میں کوئی حسرت رہ نہ جائے۔ کہو اور کیا کہنا ہے تمھیں؟"

نوجوان نے کہا،

"آخری بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس گھمنڈ میں نہ رہیے کہ جو ظلم آپ لوگوں پر کر رہے ہیں، اس کی آپ کو کبھی سزا نہیں ملے گی۔ یاد رکھیے، ایک دن آپ کو اپنے اللہ کی بارگاہ میں بھی حاضر ہونا ہے، جو ہم سب کا مالک اور آقا ہے۔ وہ آپ سے پوچھے گا کہ کیوں لوگوں کو دُکھ دیا تھا، کیوں لوگوں کو تباہ و برباد کیا تھا۔ آج آپ جو چاہیں کریں، لیکن اللہ آپ کو معاف نہیں کرے گا، کیوں کہ آپ اس کے بندوں کو ستاتے رہتے ہیں۔"

امیر تیمور کے اپنے سپاہی بھی خوف سے لرزنے لگے کہ نہ جانے غصے میں آج کیا کر بیٹھے۔ نوجوان ابھی تک اسی شان کے ساتھ کھڑا تھا اور تیمور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا۔ تیمور کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اُس نے اپنی تلوار میان سے نکال لی تھی اور کہہ رہا تھا۔ "کون ہو تم؟" نوجوان بولا، "آپ پوچھتے ہیں کون ہوں میں۔ یہ دیکھیے، ابھی آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ میں کون ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے سر سے لوہے کی ٹوپی اُتاری اور اُسے پرے پھینک دیا۔ اب وہاں ایک نوجوان کی جگہ ایک عورت کھڑی تھی۔ امیر تیمور سخت حیران ہو کر بولا، "تم ایک عورت۔"

"ہاں میں ایک تُرک عورت ہوں اور میرا نام حمیدہ بانو ہے۔ میں یہ برداشت نہ کر سکی کہ میرے بھائی تو اپنے وطن کی حفاظت کریں اور میں گھر میں بیٹھی رہوں۔ میں بھی میدان میں آگئی اور لڑتے لڑتے گرفتار ہو گئی۔" تیمور ابھی تک انتہائی حیرت سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ بولا، "ایک عورت اور اتنی بہادر۔" عورت کہنے لگی، "جس قوم کی عورتیں اس قدر بہادر ہیں کہ مَردوں کے ساتھ میدان میں لڑ سکتی ہیں۔ آپ اس قوم کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔" امیر تیمور کا سارا غصّہ ختم ہو گیا۔ بولا، "جس قوم نے تم جیسی دلیر عورت پیدا کی ہے، اُسے کوئی نہیں مٹا سکتا" اور اُسی وقت سب تُرک قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ یہ ایک عورت کی بہادری کا نتیجہ تھا۔



وطن کی محبّت

راز یوسفی

یہ کوئی ستّر سال پہلے کی بات ہے۔ جب فرانس اور جرمنی کے درمیان زبردست جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ جرمن فوجوں کا پلڑہ بھاری تھا اور وہ بڑی تیزی کے ساتھ فرانسیسی علاقوں پر قبضہ جما رہی تھیں۔ ان ہی دنوں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

جنگ کے زمانے میں فرانسیسی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے جرمن فوج کے ایک دستے نے ایک فرانسیسی گاؤں میں پڑاؤ ڈال دیا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کی آبادی چند سو آدمیوں سے زیادہ نہ تھی۔ اسی گاؤں میں ایک غریب کسان بھی رہتا تھا جس کا نام تھا گیفر میلو۔ اس غریب کسان کو اپنے گاؤں سے، گاؤں کے کچے پکّے مکانوں سے اور ہرے بھرے کھیتوں سے بہت محبت تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ملک اور وطن پر جرمنوں کا قبضہ ہو، کیونکہ وہ اس کے وطن کے دشمن تھے اور اس کے وطن کی آزادی کو ہڑپ کر لینا چاہتے تھے۔

اسے جرمنوں سے سخت نفرت تھی اور وہ ان کی صورت تک نہیں دیکھنا چاہتا تھا، مگر جب جرمن فوج کے دستے نے اس کے گاؤں پر قبضہ جما لیا تو وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ ایک نہتا اور کمزور کسان پورے فوجی دستے کا کس طرح مقابلہ کر سکتا تھا، مگر پھر بھی اس نے حوصلہ نہ ہارا اور دل ہی دل میں اپنے دشمنوں سے

بدلہ لینے کا عہد کرلیا۔

اس نے جرمن سپاہیوں کے دل میں گھر کرنے کے لیے دل کھول کر ان کی آؤ بھگت کی۔ اپنی ایک بڑی سی حویلی رہنے کے لیے ان کے حوالے کر دی۔ ان کے لیے کھانے پینے کا انتظام کیا۔ اور ہر وہ خدمت جو وہ کرسکتا تھا، کرتا رہا جس کی وجہ سے تمام جرمن سپاہی اور افسر اس سے بہت خوش رہنے لگے اور سب کے دلوں میں اس کی عزّت بڑھ گئی۔

دن گزرتے گئے۔ پھر یکایک ہر طرف ایک کھلبلی سی مچ گئی۔

ایک صبح پاس کے کھیتوں میں تین جرمن سپاہیوں کی لاشیں ملیں، جنھیں راتوں رات کسی نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ پھر دوسری صبح بھی یہی ہوا اور تیسری صبح بھی یہی کچھ دیکھنے میں آیا۔ اب تو ہر طرف پریشانی کی لہر دوڑ گئی۔ قاتل کو گرفتار کرنے کے لیے بھاگ دوڑ شروع ہوگئی، مگر قاتل اتنا ہوشیار تھا کہ کسی کے قابو میں نہ آتا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس علاقے میں کوئی جنگ بھی نہیں ہو رہی تھی اور فرانسیسی فوجیں بھی اس جگہ سے تقریباً تیس میل کی دوری پر تھیں، لیکن یہاں جنگ کے بغیر ہی جرمن سپاہی موت کے گھاٹ اترتے چلے جا رہے تھے اور اب تک چودہ سپاہی اپنی جان سے ہاتھ دھو چکے تھے۔

ایک صبح اس سے بھی زیادہ ہولناک واقعہ یہ ہوا کہ دو فوجیوں کی لاشیں کھیتوں میں پڑی ہوئی ملیں اور ساتھ ہی جانوروں کے باڑے میں گیفر میلو بے سُدھ پڑا تھا۔ اس کے چہرے پر تلواروں کی کاٹ کے نشانات تھے۔ اُدھر دونوں لاشوں میں سے ایک مردہ سپاہی کی تلوار پر بھی خون کے دھبّے تھے۔ اس واقعہ سے تمام فوجی افسروں کو گیفر میلو کے بارے میں کچھ شبہ پیدا ہوگیا کہ ہو نہ ہو یہ کارستانی اسی کی ہے مگر کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ وہ ایسی حرکت کرسکتا ہے۔ وہ بے حد شریف، ملنسار اور رحم دل تھا۔ وہ کس طرح کسی بے گناہ کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ سکتا تھا، مگر ثبوت موجود تھا، اس لیے اسے بالکل بے گناہ بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ آخر کافی سوچ بچار کے بعد جب وہ ہوش میں آیا تو اسے گرفتار کرلیا گیا۔

گیفر میلو کی عمر اس وقت اڑسٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کا جسم دبلا پتلا تھا اور کمر کچھ جھکی ہوئی تھی، مگر ابھی اس کے بازوؤں میں کافی طاقت تھی۔ اور پنجے بڑے بڑے تھے۔ چندیا پر بہت تھوڑے بال تھے جن کے نیچے سے اس کی کھوپڑی صاف نظر آتی تھی۔ جب اسے فوجی عدالت میں پیش کیا گیا تو اس وقت

تک سب اسے بے گناہ سمجھ رہے تھے۔ اور اس سے ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے مگر جب جرمن فوج کے سب سے بڑے جرنیل نے اپنی گرج دار آواز میں اس سے کہا،

"گیفر میلو، ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم بڑے نیک اور ہمدرد انسان ہو اور جب سے ہماری فوج نے تمہارے گاؤں میں پڑاؤ ڈالا ہے کسی کو تم سے کوئی شکایت نہیں ہوئی ہے، لیکن آج تمھیں یہ بتانا ہوگا کہ تمھارا چہرہ کس طرح زخمی ہوا ہے ؟"

تو گیفر میلو خاموش رہا۔ جرنیل پھر بولا "تمھاری خاموشی سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ تم مجرم ہو، مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنی زبان سے اپنے بے گناہ ہونے کا اقرار کرو۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ آج صبح جن دو سپاہیوں کی لاشیں ملی ہیں، انھیں کس نے ہلاک کیا ہے ؟"

گیفر میلو بڑے سکون سے بولا، "میں نے انھیں ہلاک کیا ہے ؟"

جرنیل کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور تھوڑی دیر کے لیے اس کی زبان گونگی ہو کر رہ گئی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی اور جتنے لوگ آس پاس کھڑے تھے، حیرت سے ایک دوسرے کا منھ تک رہے تھے۔ ہر طرف کھسر پھسر ہونے لگی جیسے کسی کو اس کی بات پر یقین نہ آ رہا ہو۔ سب کا خیال تھا کہ گیفر میلو جان بوجھ کر جھوٹ بول رہا ہے۔ شاید وہ کسی دوسرے کا الزام اپنے سر لینا چاہتا ہے۔ اس کے چہرے پر کوئی گھبراہٹ نہیں تھی وہ بڑے اطمینان سے کھڑا تھا، مگر کبھی کبھی جب وہ اپنے بیوی بچوں کو دیکھتا تو اس کے چہرے کی سرخی غائب ہو جاتی اور کچھ دیر کے لیے وہ بے چین سا ہو جاتا۔

جرنیل نے پھر پوچھا، "تم جانتے ہو، اس سے پہلے بھی چودہ سپاہی ہلاک ہو چکے ہیں۔ ان کے بارے میں تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"انھیں بھی میں نے ہی ہلاک کیا تھا ؟"

"تم نے — ؟" جرنیل چیخ کر بولا، "تم نے ان سب کو مار ڈالا ؟"

"ہاں، میں نے ان سب کو مار ڈالا۔"

"اس کام میں تمھارا کوئی اور ساتھی بھی تھا ؟"

"کوئی نہیں، یہ کام میں نے اکیلے ہی کیا تھا۔"

"اب تمھیں یہ بھی بتانا ہوگا کہ تم نے اتنے آدمی کیوں اور کس طرح ہلاک کر دیے ؟"

میلو کچھ بے چین نظر آنے لگا، کیونکہ وہ اتنا لمبا بیان نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ کچھ دیر

کے لیے چُپ ہوگیا اور نگاہیں نیچے کی طرف جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ تھوڑے سے انتظار کے بعد جرنیل چیخ کر بولا۔

"میلو، چپ رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ تمھیں یہ سب کچھ بتانا پڑے گا کہ تم نے ایسا کیوں کیا اور کس طرح چپکے چپکے اتنے آدمی موت کی گہری نیند سلا دیے؟"

میلو چونک اٹھا، پھر اس نے ایک مرتبہ بڑی مجبوری کے ساتھ اپنے بال بچوں کی طرف دیکھا اور جلدی جلدی کہنے لگا۔

"تم ہمارے ملک اور وطن کے دشمن ہو۔ تم اپنی فوجی طاقت کے بل بوتے پر ہماری آزادی چھین لینا چاہتے ہو۔ جب ہمارا پورا ملک تمھارے قبضے میں چلا جائے گا تو ہماری آزادی ختم ہو جائے گی اور ہم تمھارے غلام بن جائیں گے۔ میرے نزدیک غلامی کی زندگی سے مرجانا بہتر ہے، اسی لیے جب تمھاری فوج نے ہمارے گاؤں میں آ کر [illegible] تو میرا خون کھول اٹھا۔ میں پاگل ہوگیا، میری رگ رگ میں تمھارے خلاف نفرت سما گئی۔ میں اکیلا تمھاری فوجی طاقت کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا، مگر میں نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کرلیا کہ میں چوری چھپے جتنے سپاہی بھی مار سکتا ہوں، ماردوں گا اور

اس ارادے پر عمل کرنے کے لیے سب سے پہلے میں نے تمھارا اعتماد حاصل کیا۔ میں نے اس قدر تمھاری آؤ بھگت کی کہ تم لوگ مجھ سے خوش ہوگئے اور مجھے ہر وقت اِدھر اُدھر جانے کی آزادی مل گئی اور اسی دوران میں نے تھوڑی بہت جرمنی زبان بھی سیکھ لی۔ چنانچہ ایک رات میں ایک کھیت میں چھُپ کر بیٹھ گیا اور جب ایک گھوڑ سوار سپاہی کھیت کے پاس والی سڑک سے گزر رہا تھا تو میں نے جرمنی زبان میں چلّانا شروع کردیا۔ "بچاؤ۔ بچاؤ"، سپاہی رُک گیا اور گھوڑے سے اُتر کر آواز کی طرف لپکا۔ میں اس وقت زمین پر لیٹا ہوا تھا وہ جوں ہی مجھے زمین سے اٹھانے کے لیے مجھ پر جھکا، میں نے اپنی تلوار اس کے پیٹ میں گھونپ دی اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا، پھر میں نے اس کی وردی اُتاری اور خود پہن کر اسی رات دو اور سپاہیوں کو یہ دھوکا دے کر کہ میں بھی ان ہی کی فوج سے تعلق رکھتا ہوں۔ موت کے گھاٹ اُتار دیا، مگر آخری رات جب میں دو سپاہیوں کو مارنے لگا تو ایک سپاہی نے مجھ پر وار کیا اور اس کی تلوار سے میرا چہرہ زخمی ہوگیا۔ میں نے اس وقت تو زخم کی کوئی پرواہ نہیں کی اور انھیں مار کر ہی دم لیا، مگر ڈھور ڈنگروں کے باڑے تک پہنچ کر میری طاقت نے جواب دیدیا

اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اگلی صبح شک کی بنا پر مجھے گرفتار کر لیا گیا، جس کا مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔ فرانسیسیوں اور جرمنوں کی جنگ میں میرا ایک جوان بیٹا اور باپ مارا جا چکا ہے میں نے آج ان کا انتقام بھی لے لیا ہے۔ دو کے بدلے سولہ۔"

اور پھر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ چمک آگئی۔ جیسے اسے خوشی کا کوئی بہت بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ جرنیل کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ دیر تک اس کے چہرے کی طرف گھورتا رہا۔ اس کے دل میں رحم آگیا۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔



"گیفر میلو، تم ایک بہادر انسان ہو۔ میں تمھاری قدر کرتا ہوں۔ تمھیں اپنے وطن کے ساتھ محبت ہے۔ جس ملک میں تم جیسے وطن پرست انسان موجود ہوں، وہ کبھی غلام نہیں ہو سکتا۔ میں تمھیں زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ مگر......"

ابھی یہ الفاظ جرنیل کے منہ میں ہی تھے کہ گیفر میلو چیخ کر بولا۔ "میں زندگی کی بھیک نہیں مانگتا۔ میرے وطن کو میرے خون کی ضرورت ہے اور آزادی کا پودا خون سے ہی پروان چڑھتا ہے" اور یہ کہہ کر اس نے جرنیل کے منہ پر تھوک دیا۔

جرمن فوج کے دوسرے افسر اپنے جرنیل کی یہ بے عزتی برداشت نہ کر سکے اور بیک وقت کئی گولیاں بندوقوں سے نکل کر گیفر میلو کا سینہ چھلنی کر گئیں۔ اس کا مردہ جسم کٹی ہوئی شاخ کی طرح زمین پر گر پڑا اور اپنے پیچھے حب الوطنی کی ایک ایسی داستان چھوڑ گیا، جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گی۔

مُسلم ضیائی

سچّا لڑکا



ایک مرتبہ ایک قصبے میں دو لڑکے گیند کھیل رہے تھے۔ جس میدان میں یہ لڑکے گیند کھیلنے میں مصروف تھے، اس کے چاروں طرف لوگوں کے مکان تھے۔ لڑکے کھیل میں مگن تھے۔ کبھی گیند ادھر پھینکتے کبھی ادھر۔ بڑا لطف آرہا تھا۔ کبھی وہ دوڑ کر گیند پکڑتے اور کبھی پھینکتے۔ اس وقت انھیں چھٹی تھی۔ اسکول ختم ہو چکا تھا اور وہ لوگ اپنے اپنے گھروں سے کھیلنے کی اجازت لے کر آئے تھے۔

ابھی انھیں کھیلتے تھوڑی ہی دیر گزری تھی۔ اتنے میں ایک لڑکے نے زور سے گیند دوسرے لڑکے کی طرف پھینکی۔ وہ لڑکا گیند پکڑ نہ سکا۔ گیند ایک مکان کی کھڑکی کے شیشے میں لگی۔ چھن سے آواز آئی۔ کھڑکی کا شیشہ چکنا چور ہو گیا۔

اب تو دونوں لڑکے بہت گھبرائے۔ انھوں نے سوچا کہ اب مکان کا مالک ہمیں آکر مارے گا۔ ان میں سے ایک بہت گھبرایا اور ڈر کر بھاگ گیا۔ دوسرا لڑکا میدان میں کھڑا رہا۔ اس نے دل میں سوچا۔ قصور ہمارا ہے۔ اگر ہم یہاں گیند نہ کھیلتے تو شیشہ نہ ٹوٹتا۔ ہمیں دوسری جگہ کھیلنا چاہیے تھا۔ مکان کا مالک اپنے نوکروں پر خفا ہوگا۔ وہ سمجھے گا کہ نوکروں نے شیشہ توڑ ڈالا ہے۔ ہماری وجہ سے بیچارے نوکروں کو سزا ملے گی۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔

یہ سوچتے سوچتے وہ لڑکا خود مالک مکان سے ملنے گیا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے نوکر کو بلایا۔ پھر اس سے کہا، "اپنے مالک سے کہو کہ ایک لڑکا آپ سے ملنے آیا ہے۔ آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔"

نوکر نے مالک کو اطلاع دی۔ مالک نے لڑکے کو پاس بلا کر کرسی پر بٹھایا، پھر کہا، "کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

لڑکے نے کہا، جناب ہم دو لڑکے آپ کے مکان کے سامنے گیند کھیل رہے تھے۔ کھیلتے کھیلتے میرے ہاتھ سے پھینکی ہوئی گیند آپ کی کھڑکی کے شیشے پر لگا جس سے شیشہ ٹوٹ گیا۔ اب آپ اس کی قیمت بتا دیں، تاکہ میں اسے ادا کرنے کی تدبیر کروں۔"

مالک نے پوچھا، "کیا تم اس کی قیمت ادا کرو گے؟"

لڑکے نے کہا، "جی ہاں۔"

مالک نے شیشے کی قیمت ایک روپیہ بتائی۔ لڑکا شکریہ ادا کرکے چلا گیا۔ اس کے بعد سے بچہ ہر چوتھے روز دو آنے لے جاتا اور مالک مکان کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ اس طرح سولہ روز میں اس نے مالک مکان کو آٹھ آنے ادا کیے، پھر ایک ہفتے پیسے دینے نہ آیا۔

مالک مکان کو فکر ہوئی کہ لڑکا کیوں نہیں آ رہا ہے۔ اس نے چاہا کہ نوکروں کو بھیج کر اس کا حال معلوم کرے۔ ابھی وہ نوکر کو بھیجنے ہی والا تھا کہ لڑکے نے چار آنے لا کر مالک مکان کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

مکان کے مالک نے پوچھا اتنے روز سے تم کہاں تھے؟"

لڑکے نے کہا، "ہم لوگ بہت غریب ہیں۔ میں ایک مدرسے میں پڑھنے جاتا ہوں۔ وہاں بہت غریب بچے پڑھتے ہیں۔ مدرسے سے آنے کے بعد میں کسی امیر کے گھوڑے کو تھام کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ جو کچھ انعام ملتا ہے اس سے میرا اور میری ماں کا خرچ چلتا ہے۔ اس میں سے میں کچھ پیسے بچا کر آپ کی خدمت میں پیش کرتا تھا۔ ان دنوں بالکل مزدوری نہیں ملی، اسی لیے نہیں آیا۔"

یہ سن کر مکان کے مالک نے بچے کا نام اور اس کے گھر کا پتہ پوچھا، پھر جب مدرسے کا وقت ہو گیا تو اس کے تھوڑی دیر بعد بچے کے گھر پہنچا۔ اس کی ماں سے بچے کے بارے میں پوچھا تو ماں نے کہا، "میرا بچہ اتنا پیارا اور اچھا ہے، جیسے بچے بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہماری روزی چلتی ہے۔ وہ پڑھتا بھی ہے اور ہمارے لیے کام بھی کرتا ہے۔

مکان کا مالک اس بچے کے حالات سن کر بہت حیران ہوا۔ اس کا اپنا کوئی بچہ نہیں تھا۔ اس نے ماں سے کہا، "اپنا بچہ مجھے دے دو۔ آج سے وہ میرا بچہ ہے۔ میں اس کو اعلیٰ تعلیم دلوا کر بڑا آدمی بناؤں گا۔"

اس کے بعد اس نے بچے کی ماں اور اس کی دونوں چھوٹی بہنوں کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا، تاکہ وہ آرام سے رہیں۔ اس بچے کو اس نے اچھی تعلیم دلوائی اور لوگوں کو بلا کر اپنی ساری دولت لڑکے کے نام لکھ دیا۔



مشرقی پاکستان کی لوک کہانی

عجیب بٹوارہ

عشرت رحمانی

مشرقی پاکستان کے ایک گاؤں میں دو بھائی رہتے تھے۔ ان کے ماں باپ مر گئے تھے۔ بڑے بھائی کا نام ابراہیم تھا اور چھوٹے کا اسمٰعیل۔ ان دونوں کو باپ کے ورثے میں جو سامان اور جائداد ملی، اس میں ایک گائے اور ایک کھجور کا درخت تھا۔

بڑے بھائی نے چالاکی سے گائے کو آپس میں اس طرح تقسیم کیا کہ اسماعیل سے کہا، "تم میرے چھوٹے بھائی ہو، میں تمھیں اچھی چیز دینا چاہتا ہوں۔ گائے کا اگلا حصہ تمھارا ہے اور پچھلا حصہ میرا۔ میں تمھیں ہر حصے میں آگے رکھنے سے خوش ہوں۔"

چھوٹے بھائی نے ابراہیم کی یہ بات سنی تو خوش ہو گیا کہ واقعی میرا بڑا بھائی مجھ پر بہت مہربان ہے۔ مجھے اس نے گائے کا وہ حصہ دیا ہے جس میں اس کا منھ ہے، جس سے وہ کھاتی ہے اور زندہ رہتی ہے۔ اب بڑے بھائی نے اس سے کہا کہ "تم اپنے حصے کی دیکھ بھال کرو میں اپنے حصے کی خبر گیری کروں۔" اسماعیل روزانہ صبح شام گائے کے لیے چارہ اکٹھا کر کے لاتا اور اسے خوب کھلاتا پلاتا اور ابراہیم مزے سے گائے کا دودھ دوھتا اور اسماعیل کو اس میں سے ایک بوند بھی نہ دیتا۔ گائے خوب کھاتی اور سیروں دودھ دیتی۔

ایک مرتبہ ایک عقل مند پڑوسی نے

عجیب بٹوارہ

دونوں بھائیوں کا حال معلوم کیا اور جب اس کو اس انوکھے بٹوارے کی خبر ہوئی تو اسے ابراہیم کی چالاکی پر بڑا غصہ آیا اور اسماعیل کے سیدھے پن پر افسوس کرنے لگا۔ اس نے اسماعیل سے کہا، "تم بڑے بے وقوف ہو، جو اس تقسیم کو مان لیا۔ تم اسے کھلاتے پلاتے اور محنت کرتے ہو اور بڑا بھائی اپنی چالاکی سے اس کا سارا دودھ اپنے قبضے میں کرکے مزے اڑاتا ہے۔ تمھیں تو اس سے کچھ بھی نہ ملا۔ اسماعیل کی سمجھ میں یہ بات آگئی، مگر کیا کر سکتا تھا۔ اس نے تو ابراہیم کے بٹوارے کو پہلے مان لیا تھا۔ عقل مند آدمی نے اسماعیل کے کان میں کچھ کہا اور چلا گیا اسماعیل اس کی بات سن کر خوش ہو گیا۔

جب ابراہیم گائے کا دودھ دوہنے لگا تو اسماعیل نے ایک موٹا ڈنڈا لے کر گائے کے سر پر آہستہ آہستہ مارنا شروع کر دیا۔ اس مار سے گائے کودنے اچھلنے لگی اور ابراہیم کے لیے دودھ دوہنا مشکل ہو گیا۔ اس نے اسماعیل سے کہا، "تم یہ کیا کر رہے ہو۔ میں دودھ کیسے دوہ سکتا ہوں، گائے کو نہ مارو۔" اسماعیل نے عقل مند کی بتائی ہوئی بات دوہرا دی کہ "میں اپنے حصے کی گائے کا جو چاہے کروں، مجھے اختیار ہے۔ تمھارے حصے میں تو میں شریک نہیں ہوں تم میرے حصے میں کیوں دخل دیتے ہو۔ ابراہیم سمجھ گیا کہ کسی سمجھ دار شخص نے اسے یہ ترکیب سوجھائی ہے، آخر مجبور ہو کر اس نے سمجھوتہ کیا کہ "اچھا، آج سے میں تم کو آدھا دودھ دیا کروں گا۔ تم دودھ دوہتے وقت اسے نہ مارو۔" اسماعیل خوشی سے اس بات پر تیار ہو گیا اور اپنے بھائی کے حصے میں برابر کا شریک ہو کر دودھ لینے لگا۔ اب اسے کچھ سمجھ آگئی تھی، اس لیے اس نے ابراہیم سے کہا کہ "ہم دونوں دودھ میں برابر کے حصے دار ہیں، اس لیے میں اکیلا گائے کو چارہ نہیں کھلاؤں گا۔ تم اپنے حصے کا الگ کھلاؤ اور میں اپنے حصے کا خود کھلایا کروں گا۔" ابراہیم کو اس کی یہ بات بھی ماننی پڑی۔ اسی طرح ابراہیم نے کھجور کے درخت کی بھی تقسیم کی تھی۔ اس نے کہا کہ اگر ہم اس درخت کو دو حصوں میں کرکے برابر کا بٹوارہ کریں تو درخت سوکھ جائے گا۔ اس لیے میں تمھیں اختیار دیتا ہوں کہ جو حصہ تمھارا جی چاہے لے لو۔ کھجور کے درخت کے تنے میں اس گاؤں کے لوگ کیلیں ٹھونک کر اس سے رس نکالتے تھے اور اس سے شکر بناتے تھے۔ اسماعیل نے یہ سوچا کہ اگر میں اس درخت کا نچلا حصہ لے لوں تو مجھے گاؤں

والوں سے اس رس کی قیمت ملا کرے گی۔
اس لیے اس نے کہا کہ مجھے جڑ کی طرف سے اس کا آدھا حصّہ دے دو۔ ابراہیم نے خوشی سے منظور کر لیا۔ اب اسماعیل کو دن رات درخت سینچنے کے لیے اس کی جڑ میں پانی ڈالنا پڑتا۔ وہ دور تالاب سے پانی کی بالٹیاں بھر کر لاتا اور اسے سینچتا۔ بالٹیاں اٹھاتے اٹھاتے بے چارا اسماعیل تھک جاتا۔ ادھر ابراہیم نے چالاکی سے یہ ترکیب نکالی کہ درخت کے اوپر کے حصّے میں کیلیں ٹھونک کر ان کے نیچے بڑے بڑے برتن باندھ کے لٹکا دیے۔ جتنا رس ٹپکتا وہ سب ان برتنوں میں جمع ہوتا رہتا اور ابراہیم خوب مزے سے خود بھی پیتا اور دوسرے لوگوں کے ہاتھ بیچتا بھی تھا۔ جب سارا رس اوپر سے ہی جمع ہو جاتا تو اس کے نچلے حصّے کے تنے سے ذرا سا رس بھی نکلنے نہ پاتا۔ اسماعیل پانی ڈالتے ڈالتے بے حال ہو گیا اور اسے درخت سے کچھ بھی نہ ملا۔ آخر ایک دن اسی عقل مند آدمی نے اسماعیل کو یہ بات سمجھائی کہ تمھارے بھائی نے تم کو پھر دھوکا دیا ہے اور اس کے کان میں چپکے سے پھر کچھ کہہ کر چلا گیا۔

دوسرے دن عقل مند کی بتائی ہوئی ترکیب کے مطابق اسماعیل نے ایک کلہاڑی لے کر درخت کی جڑ کاٹنا شروع کر دی۔ ابراہیم یہ دیکھ کر بہت گھبرایا اور اس کو درخت کاٹنے سے منع کرنے لگا۔ اسماعیل نے کہا مجھے اس درخت سے کیا ملتا ہے، میں اپنا حصّہ کاٹ کر اس کی لکڑی بازار میں بیچ ڈالوں گا۔ اس سے مجھے کچھ پیسے مل جائیں گے۔ ابراہیم نے مجبور ہو کر اس سے سمجھوتہ کیا اور طے ہو گیا کہ جو رس جمع ہو گا وہ دونوں میں برابر تقسیم ہوا کرے گا۔ اسماعیل کو اب اپنے بڑے بھائی سے کوئی شکایت نہ رہی اور دونوں مل جل کر خوشی خوشی گائے کا دودھ اور کھجور کا رس پینے کھانے لگے۔

سردی کا موسم آیا تو ان دونوں نے اپنا اسباب دیکھا بھالا کہ جاڑے سے بچنے کے لیے کوئی کپڑا ملے۔ آخر انھیں ایک کمبل ملا کیوں کہ ان کا باپ بہت غریب تھا۔ ابراہیم نے اسماعیل سے کہا، "تم میرے چھوٹے بھائی ہو اس لیے میں چاہتا ہوں کہ سارا دن یہ کمبل تم اوڑھا کرو۔ رات کو سوتے وقت مجھے دید یا کرو۔ جب ہم سو جائیں تو سردی گردی کا کیا پتہ۔ اس لیے دن کو جاگتے وقت میں نہیں چاہتا کہ تم سردی میں دکھ اٹھاؤ۔ اسماعیل کو اپنے بھائی کی اس بات سے بہت

خوشی ہے۔ وہ بے چارا بھولا بھالا تھا۔
اب ہوا یہ کہ اسماعیل نے دن کو کمبل اوڑھا، مگر جب وہ کام کاج کو جاتا تو کمبل اوڑھ کر اسے کام کرنے میں دشواری ہوتی، پھر دھوپ میں کمبل گرم ہو جاتا اور اسے اتار کر الگ رکھنا پڑتا۔

رات ہوتی تو ابراہیم مزے سے کمبل لے کر اوڑھ لیتا اور آرام سے پاؤں پھیلا کر سو جاتا۔ غریب اسماعیل رات بھر سردی میں ٹھٹھرتا رہتا۔ عقل مند پڑوسی کو جب کمبل کا قصّہ معلوم ہوا تو اس نے پھر اسماعیل کے کان میں کوئی سمجھ کی بات کہی۔

جب رات کو ابراہیم کمبل اوڑھنے لگا تو وہ یہ دیکھ کر بے حد غصے ہوا کہ سارا کمبل پانی میں تربتر تھا، اس نے اسماعیل سے پوچھا یہ تم نے کیا کیا۔ اسے پانی میں بھگو دیا اب میں کیا اوڑھوں۔

اسماعیل نے عقل مند پڑوسی کی سکھائی ہوئی بات دوہرائی اور کہا "بھیّا۔ دن کو جب میں کمبل اوڑھتا ہوں تو دھوپ میں بڑی گرمی لگتی ہے، اس لیے میں نے کمبل کو ٹھنڈا کرنے کے لیے پانی میں بھگویا ہے۔ دن کو کمبل میرے حصّے میں ہے میں اسے جس طرح چاہے رکھوں اور استعمال کروں۔ اب میں کیا کروں کہ وہ ابھی تک گیلا ہے۔

اب ابراہیم کی ساری چالاکی دھری رہ گئی، وہ عقل کے سامنے اپنے سارے دھوکوں کے کرتب بھول گیا اور سخت شرمندہ ہوا کہ میں نے بار بار اپنے چھوٹے بھائی کو دھوکا دیا اور پھر عقل اور سمجھ کی بدولت منھ کی کھا کر اس سے سمجھوتے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس نے اسماعیل کو پیار سے گلے لگا لیا اور وعدہ کیا کہ اب میں کبھی تم سے کسی بات یا کام میں کوئی چالاکی یا دھوکا نہیں کروں گا۔ ہم دونوں رات کو یہ کمبل اوڑھ کر آرام سے سوئیں گے اور ہر چیز میں پیار محبّت سے برابر کے شریک رہیں گے۔ بے ایمانی اور دھوکے کا نتیجہ شرمندگی اور دُکھ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ہم دونوں مِل جُل کے آرام سے زندگی بسر کریں گے۔"

اسماعیل اپنے بھائی کی یہ باتیں سن کر بہت ہی خوش ہوا۔ اس کا دل تو پہلے ہی صاف اور سچّا تھا۔ اس نے بھی بڑے بھائی کے ساتھ مِل جل کے رہنے کا وعدہ کر لیا اور دونوں چین سے خوشی خوشی رہنے لگے۔

اسماعیل نے عقل مند پڑوسی کی مہربانی کا بہت شکریہ ادا کیا اور اب وہ ہمیشہ مشکل کام کے وقت اس عقل مند پڑوسی کے پاس جاتے اور مشورہ کرتے۔

دیس دیس کی کہانیاں

تھائی لینڈ کی لوک کہانی

توتے پر کیا بیتی

پُرانے زمانے میں توتا بہت سمجھ دار پرندہ تھا اور ہر بات کو سُن کر فوراً جواب دیتا تھا۔ وہ انسان کی نقل نہیں اُتارتا تھا، بلکہ خود انسانوں کی طرح باتیں کرتا تھا۔ تھائی لینڈ کی ایک لوک کہانی مشہور ہے۔ جس میں بتایا ہے کہ توتے نے کیوں انسانوں کی طرح باتیں کرنا بند کر دیں۔ کہتے ہیں اس دیس میں ایک شخص کے پاس ایک توتا تھا اور وہ توتا مالک کو بہت پیار کرتا تھا۔ ایک دن کیا ہوا کہ اس کا مالک اپنے ہمسائے کی بکری چوری کر کے اپنے گھر لے آیا اور بکری ذبح کر کے اپنی بیوی سے کہا کہ آدھا گوشت اس وقت کھانے کے لیے پکالو اور آدھا کل کے لیے رکھ دو۔ اُس کی بیوی نے آدھا گوشت چولھے پر پکنے کو رکھ دیا اور آدھا نعمت خانے میں حفاظت سے رکھ دیا۔ بکری کی کھال کو گودام کی چھت پر چھپا دیا۔ یہ سب کچھ میاں مٹھو دیکھ رہے تھے۔ دوسرے دن اُس شخص کا ہمسایہ اپنی بکری کو تلاش کرتا ہوا اُس کے گھر آیا اور پوچھنے لگا کہ "بھائی، کیا تم نے میری بکری دیکھی ہے؟" اُس شخص نے ابھی جواب بھی نہیں دیا تھا کہ پاس ہی توتا جو پنجرے میں لٹکا ہوا تھا، بولا، "ہاں، ہاں! میرے مالک نے تمھاری بکری کو ذبح کر دیا ہے۔ آدھا گوشت تو کھا لیا ہے اور آدھا نعمت خانے میں رکھا ہے اور اس کی کھال گودام میں پڑی ہے۔" جب ہمسائے نے یہ سب کچھ سُنا تو اُس کو بہت غصہ آیا۔ اُس نے اس کے گھر کی تلاشی لی تو اس کو بکری کا گوشت اور کھال مِل گئی۔ اس پر توتے کا مالک بولا، "یہ تمھاری بکری کا گوشت نہیں ہے۔ یہ بکری تو میں بازار سے خرید کر لایا تھا۔" توتا بولا، "نہیں یہ جھوٹ کہتے ہیں۔ یہ تمھاری بکری کا گوشت ہے۔" ہمسایہ بہت پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے کیا نہ کرے۔ توتے کی بات ٹھیک ہے یا اُس کے مالک کی۔ اور یہ صاف ظاہر تھا کہ یہ کھال اُس کی بکری کی ہے۔ آخر کار ہمسائے نے عدالت میں توتے کے مالک کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ دوسرے دن مقدمہ پیش ہونا تھا۔ توتے کا مالک بہت چالاک تھا۔ اُس نے رات کو توتے کو پنجرے سے نکالا اور ایک خالی تیل کے کنستر میں بند

کر دیا۔ اُس رات چاند کی چودہ تاریخ تھی اور موسم بھی صاف تھا۔ غریب توتا اندھیرے میں بند تھا۔ اُس کا مالک کنستر کو آہستہ آہستہ ٹھونکتا رہا اور اس کی بیوی چھلنی کے ذریعے پانی کنستر میں ڈالتی رہی۔ صبح چار بجے کے قریب توتے کو کنستر سے نکال کر پنجرے میں بند کر دیا۔ صبح نو بجے توتے کا مالک پنجرے کو عدالت میں لے گیا۔ جب مقدمہ شروع ہوا تو ہمسائے نے حاکم سے کہا، "حضور، توتے نے مجھے بتایا تھا کہ میری بکری کو اُس کے مالک نے ذبح کر دیا اور کھال گودام میں رکھی ہے۔ محلے کے تمام لوگوں نے وہ کھال دیکھی اور پہچانی کہ میری بکری کی کھال ہے۔" حاکم نے توتے سے تمام واقعہ پوچھا، توتے نے تمام واقعہ صحیح صحیح بیان کر دیا۔ توتے کے مالک نے کہا، "حضور، گوشت اور کھال میری بکری کی ہے، لیکن مجھے حیرانی ہے کہ آپ اس بے وقوف پرندے کی بات پر یقین کرتے ہیں۔ آپ میرے بیان پر کیوں یقین نہیں کرتے۔" حاکم نے کہا، "یہ پرندہ ہوشیار سمجھ دار ہے۔" توتے کے مالک نے کہا، "حضور، یہ پرندے اکثر غلط باتیں کرتے ہیں۔ ان میں بھلا اتنی سمجھ کہاں ہوتی ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اس سے ایک سوال کرتا ہوں، یہ جواب دے۔" حاکم نے توتے کے مالک سے کہا، "تمھیں اجازت ہے پرندے سے سوال کرو۔" مالک نے سوال کیا، "بتاؤ، رات موسم کیسا تھا؟" توتے نے جواب دیا، "حضور، رات سخت اندھیری تھی۔ بادل گرج رہے تھے اور بارش ہو رہی تھی۔" توتے کے مالک نے کہا، "حضور، آپ نے سُنا، یہ توتا کیا کہہ رہا ہے۔ حالانکہ کل چاندنی رات تھی، اب آپ اس کی بات کا یقین کرتے ہیں۔" حاکم نے توتے کی بات سُنی جو بالکل غلط تھی تو اُس نے فیصلہ دیا،

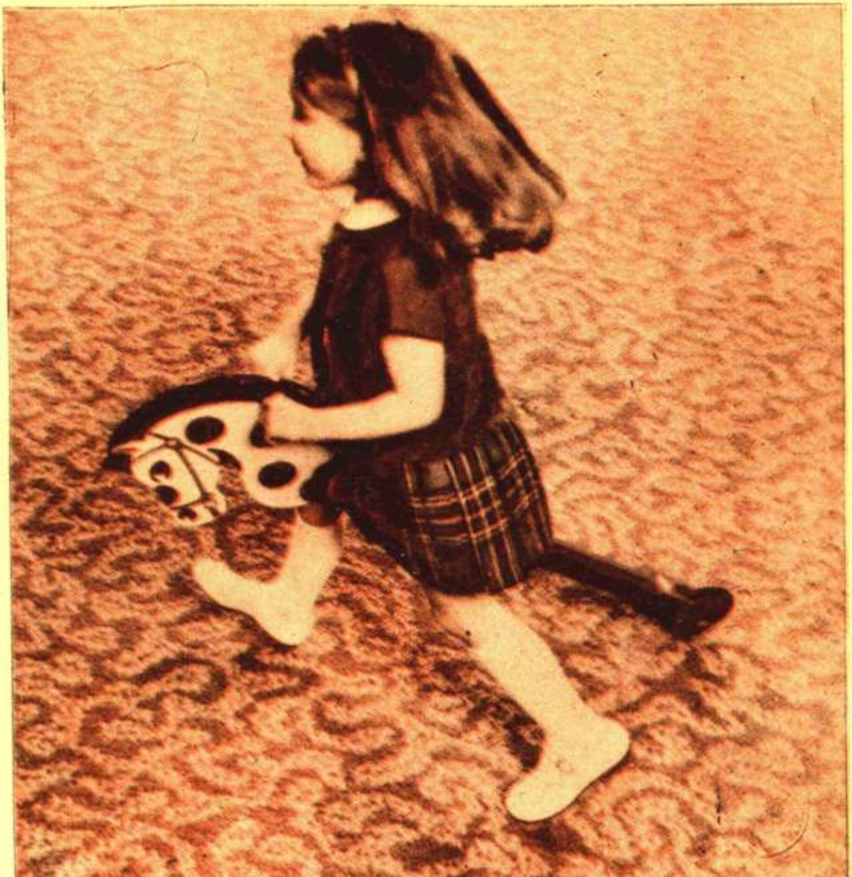
"توتا جھوٹا ہے اور اُس کا مالک بے گناہ ہے"

اور توتے کے مالک کو چھوڑ دیا۔ توتے کا مالک گھر واپس آیا۔ اُس کی بیوی نے کہا، اس نمک حرام توتے کو چھوڑ دو، ورنہ کوئی اور آفت نہ لے آئے۔ توتے کے مالک نے توتے کو پنجرے سے نکال دیا۔ توتا اُڑ کر جنگل کو چلا گیا اور اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ اور اپنے ساتھی توتوں سے کہا، بھائیو، دیکھو تم لوگوں کو میری یہ نصیحت یاد رہے۔" اگر تم کسی وقت انسان کی قید میں چلے جاؤ، تو انسان جو بولنا سکھائے، صرف وہی بار بار دہراؤ۔ اپنے پاس سے کچھ نہ کہنا۔ اس پر اِس توتے کا سب توتوں نے شکریہ ادا کیا۔ اس دن سے ساری دُنیا کے توتوں میں یہ نصیحت پھیل گئی اور سب نے اس نصیحت کو یاد رکھا۔ اس لیے جو انسان سکھاتا ہے، وہی رٹتے ہیں۔ اپنی عقل سے کوئی اور بات نہیں کرتے۔

اخبار نونہال

کارٹون





اپنے گھوڑے پر سوار یہ پیاری بچی بہت جلدی میں ہے،
لیکن قالین اس "گھڑدوڑ" میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔



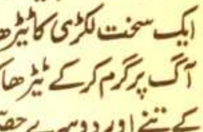
بوتل کا درخت — ایک زندہ فوارہ

اگر تم کسی ایسے گرم ریگستان میں سفر کر رہے ہو، جہاں تمام دریا خشک ہوگئے ہوں اور تم ایک بوتل نما درخت دیکھو تو شاید تمھیں یہ خیال ہوگا کہ قدرت تمھارے ساتھ مذاق کر رہی ہے یا یہ ایک چھلاوہ ہے۔ یہ بوتل کا درخت کوئنس لینڈ میں پیدا ہوتا ہے اور آسٹریلیا کے گرم حصّے میں بھی پایا جاتا ہے۔ دور سے یہ ایک بڑی بوتل معلوم ہوگا۔ مگر خالی نہیں۔ پیاسا مسافر اس نرم گودے والے درخت سے کافی پانی نکال کر اپنی پیاس بجھا سکتا ہے۔ سخت گرمی کے زمانے میں یہ بوتل کا درخت جانوروں کی جان بچاتا ہے۔ ایسے آڑے وقت میں اسے کاٹ لیا جاتا ہے اور اس کے نرم چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کٹّی کی مشین میں ڈال کر جانوروں کے لیے چارا بنالیا جاتا ہے۔ جانور اس سے خوراک بھی پاتے ہیں اور پانی بھی۔ چوپائے اس درخت کے ٹکڑوں کو جو کلہاڑی سے کاٹتے وقت اِدھر اُدھر اڑ جاتے ہیں بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ درخت کے موٹے تنے کو کاٹ کر اندر سے گودا نکال لیا جاتا ہے اور اس کی کشتی بنائی جاتی ہے۔



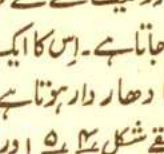
بُومے رینگ

سب سے عجیب و غریب ہتھیار جو ابتدائی دور کے انسان نے ایجاد کیا، وہ بومے رینگ (BOOMERANG) تھا۔ آسٹریلیا کے قدیم باشندے اس ہتھیار کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ ایک سخت لکڑی کا ٹیڑھا ٹکڑا ہوتا ہے، جسے آگ پر گرم کر کے ٹیڑھا کیا جاتا ہے۔ درختوں کے تنے اور دوسرے حصّوں سے بھی کاٹ کر بنایا جاتا ہے، جس طرح شکل ۱، ۲ اور ۳ میں دکھایا گیا ہے۔ بومے رینگ دو فیٹ سے لے کر

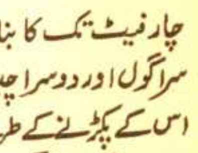


۱

چار فیٹ تک کا بنایا جاتا ہے۔ اس کا ایک سرا گول اور دوسرا چپٹا دھار دار ہوتا ہے اس کے پکڑنے کے طریقے شکل ۴، ۵ اور ۶ میں دکھلائے گئے ہیں۔ عموماً گول سرے



۳

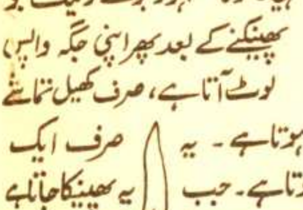


۲

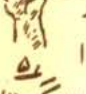
کو ہاتھ میں لیتے ہیں اور پھر ہوا میں پھینکتے ہیں۔ بومے رینگ کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ جنگ کے لیے، شکار کے لیے اور کھیل کے لیے۔ ان سب کے سائز اور تناسب علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ وہ مشہور بومے رینگ جو پھینکنے کے بعد پھر اپنی جگہ واپس لوٹ آتا ہے، صرف کھیل تماشے کے لیے ہوتا ہے۔ یہ صرف ایک کھلونا ہوتا ہے۔ جب یہ پھینکا جاتا ہے تو بجائے سیدھا جانے کے ہوا میں اوپر اٹھتا ہے اور چکّر کھا کر گول دائرہ بناتا ہوا پھینکنے والے کے پاس سر پر سے گزرتا ہوا اس کی پشت پر گرتا ہے۔ بومے رینگ پھینکنے کے چند طریقے ان خاکوں سے سمجھ میں آجائیں گے۔ شکل ۷ میں دکھایا گیا ہے



۴



۵



۶

عجیب جانور



دُو سروں والا سانپ

سانپ والوں کے پاس تم نے ایسے سانپ تو ضرور دیکھے ہوں گے جن کے دو منھ ہوتے ہیں، یعنی اُن سانپوں کی دُم کے بجائے وہاں دُوسرا منھ ہوتا ہے۔ سانپ والے جب کبھی یہ سانپ لوگوں کو دکھاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ سانپ چھے مہینے ایک منھ سے چلتا ہے اور چھے مہینے دوسرے منھ سے چلتا ہے۔ اس کو دو موئی کہتے ہیں۔ جب تم یہ سُنتے ہوگے کہ دو موئی سال کے چھے مہینے ایک منھ سے چلتی ہے اور چھے مہینے دوسرے منھ سے چلتی ہے تو تمھیں بڑا تعجب ہوتا ہوگا، لیکن دُنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنھیں دیکھنے کے بعد اس سے بھی زیادہ تعجب ہوتا ہے۔

سانپوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً اُڑنے والا سانپ۔ اُچھلنے والا سانپ اور دُو سروں والا سانپ۔

یہ دُو سروں والا سانپ دو موئی سے بالکل مختلف ہوتا ہے، حالاں کہ اگر ذرا سا غور کرو تو تمھیں خود یہ معلوم ہو جائے گا کہ کسی بھی چیز کے ایک کے بجائے دُو سَر یا دو منھ ہوں تو اُس چیز کو اِن دُو سَروں سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہو سکتا، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں بہت سی ایسی چیزیں پیدا کی ہیں جن کے ایک کے بجائے دو سَر ہوتے ہیں۔ اب اس سانپ ہی کی مثال لے لو۔ یہ ریگستان میں پایا جاتا ہے اور سخت زہریلا ہوتا ہے۔ دھڑ تو اس کا ایک ہی ہوتا ہے، لیکن چار چار اِنچ لمبی دُو گردنیں اس کے دھڑ پر بالکل اس طرح جڑی ہوتی ہیں جیسے کسی بڑے درخت کے لمبے تنے پر دُو موٹی موٹی شاخیں ہوتی ہیں۔ اس قسم کا ایک سانپ جنوبی افریقہ کے مشہور شہر پورٹ ایلزبتھ کے سانپوں کے عجائب گھر میں پلا ہوا ہے۔

اس سانپ کے دونوں سر ایک دوسرے سے لڑتے بھی ہیں۔ اس لڑائی کو روکنے کے لیے عجائب گھر کے افسران دونوں سروں کو علیحدہ علیحدہ غذا دیتے ہیں۔ چوں کہ سانپ مینڈک کو بڑے شوق سے کھاتا ہے



سونے کی بارش

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ایک مرتبہ آسمان سے سونے کی بارش ہوئی تھی، تو یہ بات بالکل ایسی معلوم ہوگی، جیسے وہ اپنا ایک خواب بیان کررہا ہے یا الف لیلہ کا قصّہ سنارہا ہے، مگر ۱۹۳۳ء میں لاس اینجلس میں واقعی ایسا ہوا تھا۔ شہر پر ریت اور ہوا کا ایک بہت بڑا طوفان آیا۔ یہ طوفان ریگستان کے علاقے سے آیا تھا۔ تمام شہر میں ریت ہی ریت ہوگئی تھی، مگر چوں کہ ریت کافی چمک دار تھی، اس لیے لوگوں نے اس کا کیمیائی تجزیہ کرایا اور تمام شہر کی ریت اکٹھی کرلی گئی، جو گھروں کی چھت پر اور صحن میں آکر گری تھی۔ معلوم یہ ہوا کہ اس میں سونے اور چاندی کے ذرّات کے علاوہ اور چیزیں بھی شامل ہیں۔ کل ریت جو شہر میں جمع کی گئی تھی، اس کا وزن ڈیڑھ ٹن تھا۔ اس میں ۵۶,۰۰۰ ڈالر کا سونا اور ۸,۰۰۰ ڈالر کی چاندی تھی۔

اس سے زیادہ اہم بات لاس اینجلس کے لوگوں کے لیے یہ تھی کہ ۸,۰۰۰ ٹن پوٹاشیم سلفیٹ بھی باغات اور سبزے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کھاد کی قیمت ۲۴۰,۰۰۰ ڈالر تھی۔ اس کے علاوہ اس ریت میں دوسرے قیمتی معدنی اور کیمیائی اجزا بھی خاصی مقدار میں شامل تھے۔ آسمان سے بلائیں ہی نازل نہیں ہوتیں، بلکہ کبھی کبھی دولت بھی برستی ہے۔



مکان بنانے کا ایک ہلکا مگر مضبوط مادہ

مغربی جرمنی کے انجینئروں نے ایک ایسا تعمیری مادہ ایجاد کیا ہے، جو پہلے سے تیار شدہ مکانوں کی تعمیر میں انقلاب انگیز تبدیلیاں پیدا کردے گا۔ اس مادہ کا نام اسٹاہالیٹ ہے اور اس سے بنے ہوئے مکان دنیا کے مضبوط سے مضبوط مکانوں کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ اسٹاہالیٹ اتنا ٹھوس ہوتا ہے کہ اس سے بنی ہوئی دیواریں وزنی الماریوں کا بوجھ برداشت کرلیتی ہیں، مگر اسی کے ساتھ وہ اتنی ہلکی بھی ہوتی ہیں کہ پانی میں نہیں ڈوبتیں۔ ان میں کیلیں بھی ٹھونکی جاسکتی ہیں اور پیچ بھی کسے جاسکتے ہیں اور انھیں مرضی کے مطابق کاٹا اور تراشا بھی جاسکتا ہے۔ یہ گرمی سردی اور دوسری موسمی آفتوں کا پوری طرح مقابلہ کرسکتی ہیں۔ یہ مادہ (اسٹاہالیٹ) نہ سڑتا ہے اور نہ گلتا ہے۔ اسے دیمک بھی نہیں کھاسکتی۔ تصویر میں ایک آدمی اسی مادے کی بنی ہوئی دیوار اٹھائے ہوئے ہے۔



شوکت علی بالو

صحت مند نونہال

اس صفحہ پر ہر ماہ صحت مند نونہالوں کی تصویریں شائع کی جائیں گی۔ جلدی سے اپنی تصویر بھیج دو!



فرح ناز، کراچی



شہناز پروین۔ کراچی



ندیم الرحمن ، نوشہرہ کلاں



ام ہانی ۔ کراچی



اللہ عزیز ، صادق آباد



پاکیزہ بشارت مرزا ۔ راولپنڈی



نوید احمد ۔ کراچی

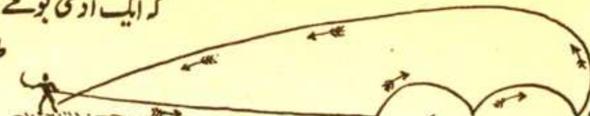


گیارہ سالہ لڑکی نے میٹرک کر لیا

سرگودھا کی ایک طالبہ آصفہ سلطانہ نے گیارہ سال کی عمر میں میٹرک کا امتحان پرائیویٹ طور پر پاس کر لیا ہے۔ اب وہ ایف۔ایس سی۔ میں داخلہ کے لیے فزکس، کیمسٹری اور اختیاری مضمون ریاضی کا امتحان دینے کی تیاری میں دن رات مصروف رہتی ہیں۔ آصفہ سلطانہ مسلم ماڈل ہائی اسکول سرگودھا کے ہیڈ ماسٹر صولت حسین کی بیٹی ہیں۔ آصفہ سلطانہ نے سات سال کی عمر میں ڈی۔ سی پرائمری اسکول گل والہ میں تیسری جماعت میں داخلہ لیا اور دو سال میں پانچویں جماعت پاس کی۔ ۱۹۶۳ء میں کنٹونمنٹ مڈل اسکول سٹلائٹ ٹاؤن سے چھٹی جماعت کے امتحان میں امتیازی نمبروں سے کام یاب ہوئیں۔

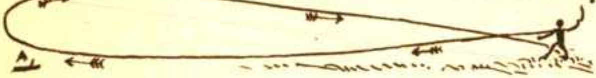
اگرچہ والد نے انھیں گھر میں امتحان کی تیاری کرائی، لیکن گل والہ کی ہیڈ مسٹریس مس خیراں اور کنٹونمنٹ بورڈ اسکول کی مسٹریس مس شہناز ملک نے ان پر خاص توجہ دی۔ آصفہ سلطانہ نے عزم ظاہر کیا ہے کہ وہ اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے تدریس کا پیشہ اختیار کریں گی۔

کہ ایک آدمی بومے رینگ کو سامنے اس
طرح پھینکتا ہے کہ وہ
زمین سے ٹکرا کر دو



۷

مرتبہ نیم دائرے نما شکل بناتے ہوئے پھر ہوا میں اونچا اٹھ کر پھینکنے والے کی پشت پر گرتا ہے۔ شکل ۸ میں بومے رینگ سیدھا ہوا میں تیرتا ہوا جاتا ہے اور پشت پر آکر گرتا ہے۔ اس کے پھینکنے کے اور کئی طریقے ہوتے ہیں۔ جنگ میں استعمال



۸

ہونے والا ایک
بومے رینگ ایسا ہوتا
ہے، جس کے سرے پر ہک ہوتا ہے۔ وہ ڈھال سے ٹکرا کر دشمن کے سر پر چکّر کھاتا ہے۔
شکل ۹ میں ایک شکاری چھپ کر بطخ کا شکار کر رہا ہے۔ وہ بومے رینگ اس انداز سے ہوا میں پھینکتا ہے کہ وہ چکّر کاٹ کر بطخ کو مار ڈالتا ہے یا زخمی کر دیتا ہے۔ آسٹریلیا کے قدیم باشندے اس عجیب و غریب ہتھیار کے استعمال میں بہت مشاق ہوتے ہیں۔



۹

★

اس لیے دونوں سَروں کو ایک ایک مینڈک علیحدہ علیحدہ کھلاتے ہیں۔

ایک مرتبہ صبح صبح جب عجائب گھر کے افسران اُس سانپ کو غذا دینے کے لیے پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سر نے دوسرے سر کو شدید زخمی کر دیا ہے، لیکن دوسرے سر میں اُس وقت تک کچھ جان باقی تھی چناں چہ دوسرے سَر کا علاج کیا گیا جس کے نتیجے میں اس وقت تو وہ اچھا ہو گیا لیکن چند دن کے بعد وہ سانپ ایک روز صبح اپنے پنجرے میں مُردہ پایا گیا۔ اسی طرح آج سے چند سال پہلے امریکا کے شہر نیویارک کے عجائب گھر میں بھی ایک سانپ تھا۔ یہ سانپ جنوبی افریقہ کے سانپوں کی اُس نسل سے تھا جو سانپوں کی بادشاہ کہلاتی ہے۔ اس سانپ کے دونوں سر تقریباً تین تین انچ لمبی گردنوں کے ذریعے دھڑ سے جڑے ہوئے تھے۔ نیویارک کے عجائب گھر کے افسروں کا کہنا ہے کہ ان دونوں سروں کے درمیان ہمیشہ اختلاف رہتا تھا یعنی ایک سر الگ ایک طرف جانا چاہتا، تو دوسرا دوسری طرف جانا چاہتا تھا اور دونوں میں اسی طرح آپس میں کھانے کے لیے جھگڑا بھی رہتا تھا۔ اس سانپ کے سانس کی دو نالیاں تھیں، لیکن پیٹ، چوں کہ ایک ہی تھا، چناں چہ عجائب گھر کے افسروں نے یہ طریقہ دریافت کیا کہ جس وقت سانپ کو کھانا دینا ہوتا اُس وقت کارڈ بورڈ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کے ذریعے وہ دونوں سَروں کے بیچ میں ایک دیوار سی کھڑی کر دیتے جس کی وجہ سے دونوں سر ایک دوسرے کو نہیں دیکھتے اور آسانی سے سانپ کا پیٹ بھر جاتا۔

دُو سر والے سانپوں کی طرح ایک کچھوے کے بھی دُو سر تھے۔ اس کچھوے کے دونوں سروں کے درمیان بھی یہی جھگڑا رہتا کہ ایک سر آگے کی طرف جانا چاہتا تو دُوسرا سَر پیچھے کی طرف۔ چناں چہ اُس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ کچھوا ایک ہی جگہ گول گول گھومتا رہتا۔

جس طرح دو سَروں والے جانور پیدا ہوتے ہیں اسی طرح کبھی کبھی انسانوں میں بھی دو سَروں والے آدمی پیدا ہو جاتے ہیں۔ چناں چہ آج سے چند سال پہلے بنگال میں ایک لڑکا تھا، جس کے دُو سر تھے یعنی اُس کی گردن کے ساتھ ایک چھوٹا سا سر علیحدہ جڑا ہوا تھا۔ اس بنگالی لڑکے کے علاوہ گزشتہ صدی میں چین میں ایک شخص ایسا بھی تھا، جس کے سینے کی ہڈی سے ایک دوسرا چھوٹا سا آدمی جڑا ہوا تھا۔

یہاں تک تو تم نے دُو سر والے جانوروں اور دُو سر والے آدمیوں کی باتیں پڑھیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے اس طرح پیدا کیا کہ وہ ہم سب لوگوں کے لیے بڑی عجیب و غریب چیز بن گئے۔ لیکن اس کے علاوہ انسانوں نے بھی مختلف نسلیں ایک دوسرے سے ملا کر بعض جانور ایسے پیدا کیے ہیں کہ جنھیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا ہے۔



لقا کبوتر۔ جس کی دُم میں ۴۸ پَر ہیں

تم نے لقا کبوتر تو ضرور دیکھے ہوں گے۔ اس کبوتر کی گردن دُم کی طرف اتنی مُڑی ہوئی ہوتی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے گردن اور دُم ابھی ابھی آپس میں مِل جائیں گے۔ اس کبوتر کی دُم بالکل پنکھے کی طرح گول ہوتی ہے۔ لقا کی دُم میں عام طور پر زیادہ سے زیادہ بارہ پَر ہوتے ہیں لیکن انسانوں نے ان کبوتروں کی خاص طرح پرورش کر کے ان کی دُم کے پَروں کی تعداد ۴۸ تک بڑھا دی لیکن اس طرح کے طریقوں سے پیدا کیے ہوئے جانوروں کی نسل بڑھائی نہیں جا سکتی، کیوں کہ عام طور پر ایسی نسلوں کی چونچ اتنی لمبی ہوتی ہے کہ عام کبوتر انھیں دانہ نہیں چُگا سکتے۔

انسانوں نے جو خاص خاص جانور اپنی کوشش سے پیدا کیے ہیں، اُن میں سب سے زیادہ مشہور یوکوہاما کا مرغا تھا۔ یوکوہاما جاپان کا ایک شہر ہے۔ اس شہر میں آج سے تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل انسانوں نے مرغوں کی مختلف نسلیں ملا کر اور مُرغ کی خاص طرح سے پرورش کر کے ایک مُرغ پیدا کیا تھا، جس کی دُم تقریباً ۳۰ فیٹ اونچی تھی۔ اس مرغ کی دُم کی حفاظت کے لیے مُرغ کو ایک پنجرے میں بند رکھا جاتا اور پنجرے کی چھت سے دُم کو باندھ دیا جاتا تاکہ دُم خراب نہ ہو۔ دن میں صرف ایک مرتبہ اس مُرغ کو خاص قسم کی ورزش کروانے کے لیے پنجرے سے باہر نکالا جاتا۔

ان مُرغوں کے علاوہ بڑی بڑی دُموں والے دُنبے تو تم نے بھی بہت دیکھے ہوں گے۔ ان دُنبوں کی خاص طور پر پرورش کی جاتی ہے، جس کے نتیجے میں بعض دُنبوں کی دُمیں تو اتنی بڑی ہو جاتی ہیں کہ اُن کے ساتھ ایک چھوٹی سی گاڑی باندھنی پڑتی ہے تاکہ دُنبوں کی دُمیں اُن گاڑیوں پر رکھی رہیں اور دُنبوں کو چلنے میں زیادہ تکلیف نہ ہو۔



بارہ سنگھا



چوپایوں کی طرح ہرن، بارہ سنگھے اور نیل گائے کے بھی کھُر ہوتے ہیں اور ان کا جگالی کرنے والے جانوروں میں شمار کیا جاتا ہے، مگر دوسرے چوپایوں اور بعض ہرنوں کے برعکس ان کے سینگ ٹھوس ہوتے ہیں۔ سینگ صرف نر ہرن کے بدلتے ہیں اور ہر سال نئے نکلتے ہیں۔ سینگوں کو اپنے اصلی سائز کے بدلنے تک دس ہفتے سے لے کر چار مہینے لگتے ہیں۔ نئے سینگ موسمِ گرما اور بہار میں نکلتے ہیں۔ اس زمانے میں ہرنی اپنے بچے پالنے میں مصروف ہوتی ہے۔ ہرن کے سر پر نئے سینگوں کے بڑھنے کے لیے جسم سے باقاعدہ خون پہنچتا رہتا ہے اور سینگوں کے اوپر نرم مخمل کی طرح کھال آجاتی ہے۔ جب شاخ دار سینگ بڑے ہو جاتے ہیں تو سر کے اس حصّے میں جہاں سے سینگ نکلتے ہیں، ایک سخت قسم کا حلقہ بن جاتا ہے اور وہ دورانِ خون کو روک دیتا ہے۔ سینگوں پر مخمل جیسا چمڑا خشک ہو جاتا ہے اور پپڑی بن کر گرتا ہے یا خود بارہ سنگھا جھاڑیوں اور درختوں سے سینگ رگڑ کر صاف کر لیتا ہے۔ ان خاکوں کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ کس طرح بارہ سنگھے کے شاخ دار سینگ ہر سال نئے نکلتے ہیں۔ خاکے اگلے صفحے پر ہیں۔

ہر سال بارہ سنگھے کے نئے سینگ کس طرح بڑھتے ہیں



۳؍اپریل ۱۷؍اپریل ۳۰؍اپریل ۱۴؍مئی ۲۸؍مئی



۹؍جولائی ۲۳؍جولائی ۴؍ستمبر

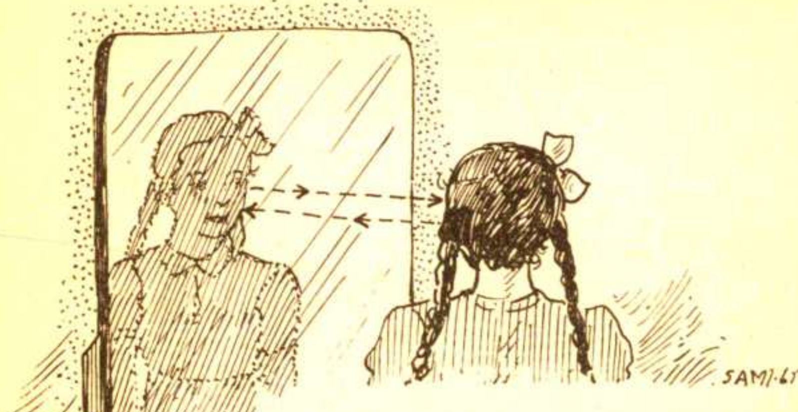
۳؍اپریل والا خاکہ موسمِ بہار کے زمانے کا ہے جب بارہ سنگھے کا سر سینگ جھڑنے کے بعد بالکل خالی ہوتا ہے۔

۱۷؍اپریل، ۳۰؍اپریل، ۱۴؍مئی اور ۲۸؍مئی کے خاکوں میں سینگوں پر "مخمل" چڑھا ہوا دکھایا گیا ہے۔ یہ جاندار کھال اس وقت تک سینگوں پر رہتی ہے، جب تک سینگ بڑے نہیں ہو جاتے۔

۹؍جولائی، ۲۳؍جولائی اور ۴؍ستمبر کے خاکوں میں دکھایا گیا ہے کہ وہ مخملی حصہ ختم ہو جاتا ہے اور سینگ سخت ہو جاتے ہیں اور مسٹر بارہ سنگھا سینگوں سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور سینگ جھڑنے تک برابر لڑتا رہتا ہے۔



ننھا سازندہ



آئینے کا جادو

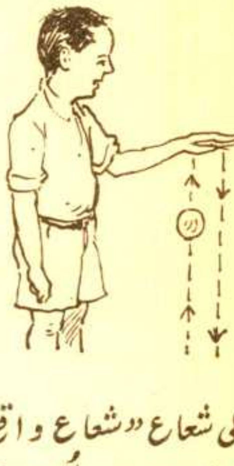
علی ناصر زیدی

تم جانتے ہو کہ ہر چیز میں سے روشنی نہیں نکلتی۔ سورج، ستارے، لالٹین، موم بتی، برقی لیمپ، چولھے کی لکڑی اور ایسی ہی دوسری چیزیں جو خود جلتی ہیں، صرف اُن سے روشنی خارج ہوتی ہے۔ ایسی تمام چیزوں یا اجسام کو ہم "روشن" کہتے ہیں۔ جب اُن کی روشنی آس پاس کی چیزوں پر پڑتی ہے اور اُن سے ٹکرا کر واپس ہوتی ہے تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم فلاں فلاں چیز دیکھ رہے ہیں۔ روشنی کے واپس ہونے کا یہ عمل "انعکاس" کہلاتا ہے۔

ہر چیز روشنی کی کچھ نہ کچھ مقدار ضرور واپس یا منعکس کرتی ہے، مثلاً سفید کاغذ کا ایک تختہ روشنی کا تقریباً پانچواں حصّہ اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور باقی واپس کر دیتا ہے۔ یہ روشنی چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ اس کے برعکس آئینے پر پڑنے والی روشنی

پوری کی پوری واپس آجاتی ہے، کیوں کہ اس کی سطح ہموار ہوتی ہے اور اُس پر بلا کی چمک ہوتی ہے، جسے ہم پالش کہتے ہیں۔

آئینے پر پڑنے والی روشنی کی مثال ایسی ہی ہے، جیسے لکڑی کی کوئی سخت گیند کسی گدّے سے ٹکرائے۔ وہ جس زاویے پر ٹکراتی ہے، اُسی سے واپس آجاتی ہے۔ آئینے پر



پڑنے والی شعاع "شعاع واقع" کہلاتی ہے اور جب وہ اُس سے ٹکرا کر واپس آتی ہے تو ہم اُسے "شعاع انعکاس" کہتے ہیں، کیوں کہ انعکاس کے معنی پلٹنے کے ہیں۔

کسی بھی شعاع کی سمت اُس زاویے سے نہیں معلوم کی جاتی، جو وہ آئینے کی سطح کے ساتھ بناتی ہے بلکہ اس زاویے کے ذریعے طے کی جاتی ہے، جو وہ اُس جگہ گرنے والے عمود کے ساتھ بناتی ہے۔ یہ عمود اس جگہ کھینچا جاتا ہے جہاں شعاع واقع آئینے سے ٹکراتی ہے۔ منعکس ہونے والی شعاع اِسی عمود کے ساتھ جو زاویہ بناتی ہے، اُسے "زاویۂ انعکاس" کہتے ہیں۔

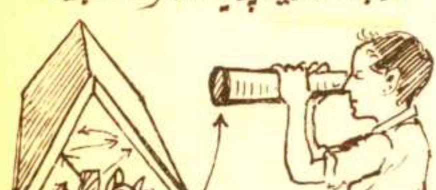
سائنس والوں کے آسانی کے لیے انعکاس کے لیے ایک قاعدہ بنالیا ہے اور وہ یہ کہ زاویۂ وقوع ہمیشہ زاویۂ انعکاس کے برابر ہوتا ہے، یعنی آنے والی شعاع عمود کے ساتھ جو زاویہ بناتی ہے، وہ اُس زاویے کے برابر ہوتا ہے، جو واپس آنے والی شعاع عمود کے ساتھ بناتی ہے۔

جب تم آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہو تو وہ آئینے کے اندر اُتنا ہی گہرا معلوم ہوتا ہے، جتنے تم آئینے سے دور ہو۔ شاید تم نے کبھی سوچا ہو کہ آئینے میں عکس کیوں بنتا ہے۔ بات

در اصل یہ ہے کہ شعاعِ واقع یا آئینے پر پڑنے والی روشنی کی کرنیں آئینے سے ٹکرا کر سیدھی واپس نہیں، بلکہ مڑ کر آتی ہیں۔ ہم اُن کے خمیدہ یا مڑے ہوئے راستے کے ساتھ ساتھ نگاہ نہیں دوڑا سکتے۔ ہم سیدھا دیکھتے ہیں اور ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ شعاع آئینے کے پیچھے کسی نقطے سے آ رہی ہے۔ جب بے شمار شعاعیں ہماری آنکھ پر یہ اثر ڈالتی ہیں تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ جسم جو آئینے کے سامنے ہے، آئینے کے پیچھے اُتنے ہی فاصلے پر اپنا عکس بنا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ آئینے کے پیچھے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ محض نظر کا دھوکہ ہے، اسی لیے اس عکس کو ہم اصلی عکس نہیں کہتے، بلکہ "عکسِ مجازی" کہتے ہیں۔

ایک اور دل چسپ بات یہ ہے کہ آئینے میں ہمارا عکس الٹا ہو جاتا ہے، جب تم کسی آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے دائیں ہاتھ سے کنگھا کرتے ہو تو تمھیں اس بات کا بالکل احساس نہیں ہوتا کہ تمھارا دایاں ہاتھ آئینے میں بایاں معلوم ہو رہا ہے، لیکن اگر تمھارے پیچھے کھڑا ہوا تمھارا دوست تمھارا عکس دیکھے تو اسے ایسا ہی معلوم ہوگا کہ تم اپنے بائیں ہاتھ سے کنگھا کر رہے ہو۔ اگر یقین نہ آئے تو تجربہ کر کے دیکھ لو۔

دو آئینوں کو ایک دوسرے سے ملا کر کھڑا کرنے سے بڑے خوب صورت اور دل چسپ عکس پیدا ہو جاتے ہیں۔ شاید تم نے دوربین جیسا وہ کھلونا دیکھا ہو جس میں دھات یا کانچ کے تھوڑے سے رنگین ٹکڑے پڑے رہتے ہیں، ان ٹکڑوں کو ہلانے سے بڑے خوب صورت عکس بنتے ہیں، ہر مرتبہ نیا عکس نظر آتا ہے۔ اُس کے اندر اصل میں تین آئینے ہوتے ہیں، جو ساٹھ درجے کے زاویے پر ایک دوسرے سے جڑے



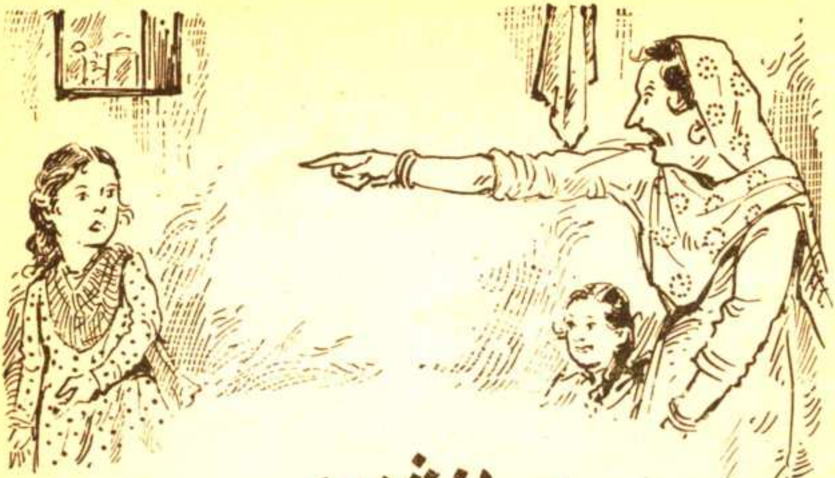
ہوتے ہیں۔ دونوں کے بیچ میں رنگین دھات کے کچھ ٹکڑے ہوتے ہیں۔ ایک آئینے میں اِن ٹکڑوں کا پہلا عکس بنتا ہے۔ اس عکس کا دوسرا عکس دوسرے آئینے میں بنتا ہے۔ اس کا عکس تیسرے آئینے میں بنتا ہے اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے۔ اسی وجہ سے تمھیں ایک ہی چیز کے کئی عکس نظر آتے ہیں۔ یہ کھلونا سائنس کے اس معمولی اصول پر بنایا جاتا ہے، اسے انگریزی میں "کلائڈسکوپ" کہتے ہیں۔

ترانہ

ناصرہ بانو



ہم ہیں پاکِستانی
ہم سب ہیں پاکستانی
سب ہیں وطن کی لاج کہ یہ ہے سب کا پاکِستان
بنگالی ہو پنجابی ہو یا ہو کوئی پٹھان
کوئی بلوچستانی ہو یا کوئی بلتستانی
ہم ہیں پاکِستانی
ہم سب ہیں پاکستانی
ذرّہ ذرّہ اس مٹی کا اپنی آنکھ کا تارا
اس کے دریاؤں کا پانی جیسے شہد کا دھارا
اس کی صبح امنگوں والی اس کی شام سہانی
ہم ہیں پاکستانی
ہم سب ہیں پاکِستانی
سبز ہلالی پرچم لے کر مِل کر قدم اٹھائیں
زندہ قوموں کی مانند ہم آگے بڑھتے جائیں
جب بھی اس کو پڑے ضرورت ہم سب دیں قربانی
ہم ہیں پاکِستانی
ہم سب ہیں پاکِستانی



سونی شہزادی

ایک تھی عورت۔ اس کی ایک بیٹی تھی۔ اس کا نام تھا سونی۔ پیاری پیاری صورت، اچھے اچھے ہاتھ پیر! ماں بیمار پڑی تھی۔ دوا علاج سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ آخر وہ مرگئی۔ باپ نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں سونی کو پیار نہیں کرتی تھی۔ کچھ دنوں پیچھے اس سوتیلی ماں کے ہاں بھی ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کا نام تھا مونی۔ صورت شکل اس کی بھی اچھی تھی۔ سونی اسے بہت پیار کرتی تھی، لیکن جب سے یہ پیدا ہوئی، تب سے سوتیلی ماں سونی سے برا سلوک کرنے لگی اور اس پر ظلم کرنے لگی۔

ایک دن سوتیلی ماں نے شکر میں ریت ملا کر کہا، "سونی! شکر اور ریت جدا جدا کر دے، نہیں تو ایسا ماروں گی کہ جنم جنم کو یاد کرے گی۔" کام مشکل تھا، آسان نہیں تھا۔ سونی شکر لے کر گھر سے باہر آئی اور رونے لگی۔ اس نے ایک دن چیونٹیوں کو شکر کھلائی تھی۔ اسے روتی ہوئی دیکھ کر چیونٹیاں آئیں اور پوچھنے لگیں، "سونی! کیوں روتی ہے؟" سونی بولی، "شکر میں ریت مل گئی تھی، اماں کہتی ہیں کہ الگ الگ کر لا۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔" چیونٹیوں نے کہا، "تو نہ رو، ہم الگ کیے دیتے ہیں۔"

ہزاروں چیونٹیاں آئیں اور شکر اور ریت کو دم کے دم میں الگ کر دیا۔ سونی نے لا کر سوتیلی ماں کو دیا۔ وہ خوش نہیں ہوئی، مگر چپ رہ گئی۔

دوسرے دن سوتیلی ماں نے چھلنی دے کر کہا، "سونی! جا اس میں پانی بھر لا!"، سونی چھلنی لے کر پانی بھرنے گئی۔ جتنا پانی ڈالتی۔ سب کا سب بہہ جاتا۔ تب وہ پھر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ مکڑیوں نے سُنا۔ سونی مکڑی کو بچا کر جھاڑو دیا کرتی تھی۔ وہ اس سے خوش تھیں کہنے لگیں، "سونی! کیوں روتی ہے؟" اس نے جواب دیا، "اماں نے چھلنی میں پانی بھرنے کو کہا ہے۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔"

مکڑی بولی، "تو نہ رو۔ ہم چھلنی کے سوراخ اپنے جالے سے بند کیے دیتے ہیں، پھر پانی نہ ٹپکے گا۔" ہزاروں مکڑیاں آئیں اور دم کے دم میں چھلنی کے سوراخ پتلے جالے سے بند کر گئیں۔ سونی اس میں پانی بھر لائی، ماں کو دیا۔ وہ خوش نہیں ہوئی، لیکن چُپ رہی۔

تیسرے دن سوتیلی ماں نے پانچ سیر دھان سونی کو دے کر کہا، "جا دھان سے چاول نکال لا، نہیں تو ماروں گی۔" سونی دھان اٹھا کر باہر لائی اور لگی رونے۔ ایک پھدکی چڑیا نے اسے روتے دیکھا، "سونی بیٹی تو کیوں روتی ہے؟"، سونی نے جواب دیا، "اماں نے دھان سے چاول نکالنے کو کہا ہے۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔" پھدکی بولی، "تو نہ رو۔ ہم چاول نکال دیں گے۔"

یہ کہہ کر پھدکی پھر سے اُڑ گئی۔ اپنے ساتھ سینکڑوں پھدکیاں لائی۔ سب نے اپنی چونچ سے بھوسی اور چاول دم کے دم میں الگ کر دیے۔ سونی چاول لائی، ماں کو دیے۔ وہ خوش نہیں ہوئی لیکن چُپ رہی۔

سوتیلی ماں جو مشکل کام دیتی سونی دوسروں کی مدد سے اسے کر دیتی، کیونکہ وہ نیک تھی اور سب اسے پیار کرتے تھے۔ ماں چاہتی تھی کہ کوئی بہانہ ملے اور وہ اسے مارے، لیکن بہانہ نہیں ملتا تھا۔ تب اس نے ایک دن سونی کو ساتھ لیا اور جنگل میں چھوڑ آئی۔ نہیں تو شادی میں ہزاروں روپے خرچ کرنے پڑیں گے۔ جنگل میں نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے! وہ اکیلی تھی۔ چیونٹی، مکڑی اور پھدکی تینوں نے دیکھا کہ گھر میں سونی نہیں ہے کھوج لینے نکلیں۔ جنگل میں آئیں۔ سونی رو رہی تھی تینوں نے پوچھا، "سونی بیٹی! کیوں روتی ہے؟"، سونی نے کہا، "اماں نے گھر سے نکال دیا اور جنگل میں چھوڑ گئی ہے اب مجھے کون کھانا پانی اور کپڑے دے گا۔" تینوں بولیں، "تو نہ رو، ہم سب کر دیں گے۔"

چیونٹی دوڑی کھانے کی چیزیں لائی، پھدکی اڑی، چونچ میں پانی بھر لائی۔ مکڑی نے سفید کپڑے کا باریک تھان لا دیا۔ یہ کھا پی کر اور نئے کپڑے پہن کر بیٹھی اور خوش تھی۔ اس ملک کے حاکم کا لڑکا جنگل میں شکار کھیلنے آیا تھا۔ راہ بھول گیا تھا۔ اکیلا اور بھوکا پیاسا تھا۔ اس کی نظر سونی پر پڑی، پاس آیا۔ پوچھا، "تو کون ہے؟" اس نے کہا، "میں سونی ہوں!"

راجہ کے لڑکے نے کہا، "میں شکار کو آیا تھا۔

(باقی صفحہ ۴۷ پر)

حسین حسنی

بات کی بات



پہلے زمانے میں ہمارے بزرگ خاص طور پر دادیاں، نانیاں بچّوں کو رات کے وقت کہانیاں سُنایا کرتی تھیں۔ بچّے یہ کہانیاں بڑے شوق سے سُنا کرتے تھے۔ اب یہ رواج کم ہوتا جا رہا ہے، لیکن یہ کہانیاں یاد رکھنے اور محفوظ کرنے کے قابل ہیں۔ ان کہانیوں کا اندازِ بیان ایک خاص طرح کا ہوتا تھا۔ آج ایک ایسی ہی کہانی سُنو!

ادارہ

بات کی بات۔ خرافات کی لات۔ ببول کے کانٹے پر تین تالاب۔ دو سوکھے ساکھے۔ ایک میں پانی نہیں۔ جس میں پانی نہیں، اس میں بسے تین کمہار۔ دو لنگڑے لولے ایک کے ہاتھ نہیں۔ جس کے ہاتھ نہیں، اس نے بنائیں تین ہانڈیاں۔ دو ٹوٹی پھوٹی۔ ایک کا پیندہ نہیں۔ جس کا پیندہ نہیں، اس میں پکائے تین چاول۔ دو اینٹھے سنیٹھے۔ ایک گلا نہیں۔ جو گلا نہیں، اس پہ بلائے تین مہمان۔ دو روٹھے راٹھے، ایک آیا ہی نہیں۔ جو آیا نہیں، اس کے مارے تین ڈنڈے۔ دو ادکے چوکے، ایک لگا نہیں۔ جو لگا نہیں، وہ گرا ایک چنے کے کھیت میں۔

وہاں ایک ہاتھی چر رہا تھا۔ وہ ڈنڈا ہاتھی کے لگا۔ ہاتھی سمجھا کہ یہ ڈنڈا میرے چرانے والوں نے مارا ہے۔ وہ غصے ہو کر آدمیوں کے پیچھے دوڑا۔ آدمی اپنی جان بچانے کے لیے بھاگے جب ہاتھی قریب آیا تو گھبرا کر چنے کے درخت پر چڑھ گئے۔ ہاتھی بھی آدمیوں کے پیچھے درخت پر چڑھ گیا۔

ہاتھی ڈال ڈال تو آدمی پات پات!

آدمی پات پات تو ہاتھی ڈال ڈال۔ بھاگتے بھاگتے راستے میں ایک بدھنا ملا۔ آدمی اپنی جان بچانے کے لیے۔ بدھنے میں گھس گئے۔ ہاتھی نے

بڑھنے کا چکر لگایا تاکہ کوئی راستہ ہو تو وہ بھی اندر جائے، مگر راستہ نہ ملا۔

وہ بھی بڑھنے کے اندر گھس گیا۔ آدمیوں نے دیکھا کہ ہاتھی اندر آگیا ہے تو وہ بڑھنے کی ٹونٹی میں سے نکل کر بھاگ گئے۔

ہاتھی بھی ٹونٹی میں سے نکلنے لگا۔ ہاتھی ٹونٹی میں سے تو نکل گیا، مگر اس کی دُم ٹونٹی ہی میں پھنس گئی۔

دونوں آدمی آپس میں جھگڑنے لگے۔ ایک کہتا تھا،

"تو نے ڈنڈا مارا تھا۔"

دوسرا کہتا تھا،

"نہیں! تو نے مارا تھا۔"

اُدھر سے ستّر۷۰ بہتّر۷۲ برس کی ایک بڑھیا آرہی تھی، جو اپنے لڑکے کا کھانا لے کر جنگل میں جارہی تھی۔ وہ لڑکا نوتنّے۹۹ اونٹ چراتا تھا۔ بڑھیا نے لڑکے سے کہہ رکھا تھا کہ

"اگر تو نے ٹھیک سے اونٹ نہیں چرائے تو میں تجھے ہاؤ سے ڈرا دوں گی۔"

بڑھیا نے دیکھا کہ دو آدمی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ایک کہتا ہے،

"تو نے مارا تھا۔"

دوسرا کہتا ہے،

"تو نے مارا تھا۔"

بڑھیا نے دونوں سے پوچھا،

"بھئی کیا معاملہ ہے؟ آپس میں کیوں لڑ رہے ہو؟"

دونوں نے سارا قصّہ سُنایا۔ بڑھیا کہنے لگی،

"اچھا! تمھیں لڑنا ہی ہے تو تم دونوں میرے کندھوں پر سوار ہو جاؤ اور اپنی لڑائی لڑتے رہو۔"

اور دل میں سوچا، "چلو! آج لڑکے کو ڈرا دوں۔ میرے کندھوں پر دو آدمیوں کو لڑتا دیکھ کر سمجھے گا کہ 'ہاؤ' آگیا ہے، پھر شرارت بھی نہیں کرے گا اور اونٹ بھی ٹھیک سے چرائے گا۔"

بس! بڑھیا نے دونوں آدمیوں کو اپنے دونوں کندھوں پر بٹھالیا اور چلدی۔

بڑھیا کے لڑکے نے دُور سے بڑھیا کو اس حُلیے میں آتا دیکھا تو وہ سمجھا کہ آج اماں 'ہاؤ' لے آئی۔ اُس نے جلدی سے اپنا رومال پھیلایا اور سارے کے سارے نوتنّے۹۹ اونٹوں کو سمیٹ۔ رومال میں لپیٹ۔ گٹھری باندھ۔ سر پر رکھ۔ بھاگ کھڑا ہوا۔

آسمان پر ایک چیل اُڑ رہی تھی، جو

بارہ ۱۲ اور بارہ ۱۲ چوبیس ۲۴ برس سے بھوکی تھی۔ اس نے لڑکے کے سر پر گٹھری دیکھی تو سمجھی شاید کوئی کھانے کی چیز مل جائے۔ اس نے جھپٹا مارا اور گٹھری لے یہ جا، وہ جا۔

بھوکی تو تھی ہی۔ اس نے اڑتے اڑتے گٹھری میں ایک چونچ ماری تو گٹھری پنجوں میں سے چھوٹ گئی۔

نیچے راجہ کا محل تھا، اس کی لڑکی کھلی چھت پر نہا رہی تھی۔ وہ گٹھری راج کماری کی آنکھ میں گری۔ وہ تڑپ گئی۔ اس نے اپنی دایہ سے جو نہلا رہی تھی کہا،

"دیکھنا! میری آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے۔"

دایہ نے آنکھ میں دیکھا تو اس کو ایک گٹھری نظر آئی۔ اس نے گٹھری نکال کر میلے دوپٹے کے پلّو میں باندھ دی اور راج کماری کو نہلاتی رہی۔ نہلانے دھلانے میں گٹھری کھولنا بھول گئی۔

جب راج کماری کے میلے کپڑے دھوبی کے یہاں دُھلنے گئے تو ان میں وہ دوپٹہ بھی چلا گیا۔ دھوبی کپڑے دھونے سے پہلے سب کپڑوں کو اچھی طرح دیکھ بھال لیتے ہیں۔ اس دیکھا بھالی میں دوپٹے میں جو گٹھری بندھی چلی گئی تھی، وہ مل گئی۔

دھوبن نے جب گٹھری کھولی تو اس میں سے بلبلاتے ہوئے نوّے ۹۰ اونٹ نکلے۔ دھوبن دھوبی بڑے خوش ہوئے کہ چلو مفت میں اتنے اونٹ ہاتھ آئے۔

اتنے بہت سے اونٹ دیکھ کر دوسرے دھوبیوں کو حسد ہوا۔ انھوں نے جا کر راجہ سے کہہ دیا۔

"حجور! فلانے دھوبی نے رات کو کہیں بڑا لمبا ہاتھ مارا ہے۔ کل تک اس کے پاس ایک بوڑھی گدھیا تھی۔ آج نوّے ۹۰ اونٹ ہیں۔"

راجہ نے دھوبی اور دھوبن کو پکڑوا بلایا۔ دربار میں دھوبن نے کہا،

"حجور! یہ چوری نہیں ہے، بلکہ پرکھوں کے زمانے کی گدھیا ہے۔ اس نے کبھی بچے نہیں دیے تھے۔ رات بیا گئی۔ یہ سب اونٹ اسی کے بچے ہیں۔"

فیصلہ ہوا کہ

"یہ جھوٹ بولتی ہے سارے اونٹ گرفتار کر کے لاؤ۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ گدھیا اونٹ بچے دے۔"

سپاہی پکڑنے گئے تو سب اونٹ چنے کے کھیت میں چر رہے تھے۔ سپاہی سب اونٹ گھیر کر لے آئے۔ جب گنتی ہوئی تو دیکھا کہ ایک اونٹ کم ہے۔

سب لوگ اونٹ تلاش کرنے لگے۔

بات کی بات

اونٹ کے بلبلانے کی آواز تو آرہی ہے، مگر اونٹ دکھائی نہیں دیتا۔ جب تلاش کرتے کرتے سب تھک گئے تو حکم ہوا،

"کھیت کاٹ ڈالو!"

کھیت کاٹا گیا۔ کھلیان لگا۔ اونٹ کے بلبلانے کی آواز آتی رہی، مگر اونٹ نہ ملا۔ کھلیان پر بیل چلائے گئے۔ بھوسا اڑایا گیا، پھر بھی آواز تو آتی رہی، مگر اونٹ نہ ملا۔ حکم ہوا،

"بیسن پیسا جائے!"

چنوں کا بیسن پیسا گیا کہ شاید بیسن میں تو اونٹ دکھائی دے گا۔ بیسن میں سے آواز تو آتی رہی، مگر اونٹ دکھائی نہ دیا۔ حکم ہوا۔

"پھلکیاں تلی جائیں!"

بیسن کی پھلکیاں تلی گئیں۔ کڑھائی میں سے آواز تو آتی رہی، مگر اونٹ پھر بھی نہ دکھائی دیا۔

پھلکیاں راجہ کے دربار میں سب کو بانٹی گئیں۔ حکم ہوا،

"ہمارے سامنے توڑ کر کھاؤ۔ دیکھیں اونٹ کہاں سے نکلتا ہے۔"

جو پھلکی راجہ نے اٹھائی اور توڑی تو اونٹ اس راجہ والی پھلکی میں سے بلبلاتا ہوا نکلا۔

راجہ نے دھوبی اور دھوبن کو معاف کر دیا اور اونٹ اپنے شتر خانے میں بھجوا دیے۔

بقیہ "سونی شہزادی"

بھٹک گیا ہوں۔ بھوکا پیاسا ہوں۔ میرے کپڑے بھی میلے ہو گئے ہیں۔ کیا تو میری مدد کر سکتی ہے؟"

سونی بولی، "میں غریب ہوں۔ چیونٹی مجھے کھلاتی ہے، پھدکی مجھے پانی پلاتی ہے، مکڑی کپڑے پہناتی ہے۔ تم کہو تو ان سے مدد کے لیے کہوں۔" راجہ کے لڑکے کو سن کر تعجب ہوا، مگر منظور کر لیا۔ تب سونی نے اشارہ کیا۔ چیونٹی دوڑی کھانے کا سامان لائی، پھدکی اڑی چونچ میں پانی بھر لائی۔ مکڑی سفید کپڑے بُن لائی۔ حاکم کے لڑکے نے کھایا، پیا، پہنا خوش ہوا۔

اس نے سونی سے کہا، "جنگل میں کیا کرتی ہے میرے ساتھ چل۔ میں تجھے حاکم سے انعام دلاؤں گا۔"

سونی بولی، "اور یہ چیونٹی پھدکی اور مکڑی؟"

اس نے کہا، "یہ بھی ساتھ چلیں۔"

پھر لڑکے نے سونی کو گھوڑے پر بٹھالیا چیونٹی اور مکڑی کو توبڑے میں رکھا۔ پھدکی کو کندھے پر بٹھایا پانچوں محل میں آئے۔ حاکم نے سونی کی نیکیوں کا حال سن کر اسے اپنے بیٹے سے بیاہ دیا۔ اب سونی شہزادی بن کر خوشی خوشی محل میں رہنے لگی۔

سیاحوں کی کہانیاں



چینی سیّاح فاہیان

اُزیر احمد

بچّو! اگر آج کل تم چین جانا چاہو تو کراچی سے جہاز میں سوار ہو جاؤ گے اور بحیرۂ عرب اور بحرِ ہند کو پار کر کے سنگاپور کی بڑی بندرگاہ پر پہنچو گے، پھر وہاں سے بحیرۂ چین ہوتے ہوئے ہانگ کانگ سے یا تو تم کینٹن جاؤ گے یا ساحلِ چین کے کنارے کنارے شنگھائی کی موجودہ بندرگاہ تک یا اس سے بھی اور آگے جہاں سے ریل میں سوار ہو کر تم چین کے دارالسلطنت پہنچ سکتے ہو، لیکن ہزار بارہ سو سال قبل کراچی یا کینٹن یا شنگھائی مشہور جگہیں نہ تھیں اور چین اور ہندُستان کے درمیان سفر کرنے والے سیّاحوں کو ایک دم [illegible] راستوں سے جانا ہوتا تھا۔ اس زمانے میں نہ تو ریل گاڑیاں تھیں اور نہ بھاپ سے چلنے والے جہاز اور سیاحوں کو سفر پر روانہ ہوتے وقت یہ بھی یقین نہیں رہتا تھا کہ وہ لوٹ کر گھر واپس آ بھی سکیں گے۔

اس زمانے میں سمندر کے سفر خشکی کے سفر سے زیادہ خطرناک خیال کیے جاتے تھے، کیوں کہ یہ تو ہو سکتا تھا کہ صرف قیمتی چیزوں اور رُپے پیسے کا نقصان کر کے لٹیروں اور دشمنوں سے آدمی جان بچا لے، لیکن اگر ایک بے جانے ہوئے اجنبی سمندر میں جہاز پھنس جائے تو پھر بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ شاید اسی وجہ سے بودھ مذہب کے سینکڑوں مبلغوں نے چین میں اپنا مذہب پھیلانے کے لیے سمندر کی موجوں کا مقابلہ کرنے کے بدلے ہمالہ کی برف کا سامنا اور وسط ایشیا کے صحراؤں کی تکالیف جھیلنا پسند کیا۔

تم نے کتابوں میں چین کے مشہور راہب اور سیّاح فاہیان کے بارے میں پڑھا ہو گا۔ وہ پندرہویں صدی عیسوی کے شروع میں ہندُستان آیا تھا اور یہاں پندرہ سال تک مذہب اور فلسفے کا مطالعہ کرتا رہا۔ آج میں اسی کے سفر کا قصّہ تمھیں سُناؤں گا۔

فاہیان کے تین چار سو سال پہلے سے بودھ مذہب چین میں پھیل رہا تھا۔ تمام وسط ایشیا میں، مغرب میں پامیر کے اطراف سے لے کر مشرق میں دریائے ہوآنگو کے دہانے تک سینکڑوں عبادت گاہیں قائم تھیں اور اُن میں ہزاروں راہب رہتے تھے۔ ہر زمانے میں بودھ مذہب کے سینکڑوں بزرگ ہندستان سے ان جگھوں میں جاتے اور مہاتما بدھ کے مذہب کی تبلیغ اور اشاعت کرتے، لیکن کسی چینی نے اس وقت تک وسط ایشیا کے صحراؤں سے گزر کر ہندُستان کی بڑی عبادت گاہوں اور تعلیمی مرکزوں تک آنے کی ہمت نہ کی تھی۔ ہندستانی عالم جو چین میں رہتے اور تبلیغ کرتے تھے، ان سے صرف انھوں نے ان کے نام اور شہرت سُنی تھی۔

فاہیان نے چند پاک خیال ساتھیوں کے ساتھ ہندُستان آنے کا ارادہ کیا۔ یہاں آکر اس کا ارادہ بدھ مذہب کی پاک جگھوں کی زیارت اور اُس کی مقدس کتابوں اور فرمانوں کو جمع کرنا اور نقل کرنا تھا۔ آج کل ہم ہر ملک اور ہر زبان کی کتابیں آسانی سے گھر بیٹھے معمولی داموں پر خرید کر پڑھ سکتے ہیں، لیکن اُس زمانے میں آج کل جیسی چھپائی کا نام بھی کوئی نہ جانتا تھا۔ کتابوں کو ہاتھ سے نقل کرنا پڑتا تھا اور جتنی بڑی کتاب ہوتی نقل کرنے میں اتنا ہی زیادہ وقت لگتا تھا۔ بدھ مذہب کی پتا کائیں، جن کا پڑھنا بدھ مذہب کے ہر آدمی کے لیے ویسے ہی لازمی تھا، جیسے ہمارے لیے قرآن شریف، دُنیا کی سب سے بڑی کتابوں میں شمار ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں بھی اس کتاب کی صرف چند کاپیاں تھیں۔ اس طرح تم آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہو کہ فاہیان نے شمالی مغربی ہندُستان کے میدانی حصہ تک پہنچنے کے لیے گوبی ریگستان اور پھر اس کے جنوب میں سینکڑوں میل لانبے اونچے پہاڑوں کا دشوار اور کٹھن راستہ اختیار کر کے کتنا زبردست کام اپنے ذمہ لیا تھا۔

فاہیان کے سفر کا پہلا حصہ ۴۰° ڈگری شمالی عرض البلد کے پاس سے شروع ہو کر کوتان کے شہروں کے قریب شمال کی طرف پھیلا ہوا تھا۔ اس جگہ تک پہنچنے میں اس کو تین سال لگ گئے۔ وہاں وہ تین مہینے تک ٹھیرا رہا اور وہاں کے مشہور عالم بدھ مذہب کے جلوس کو دیکھا۔ اس جلوس کی تفصیل پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ پوری (ہندستان) کے جگناتھ کے رتھ جاترا سے ملتا جُلتا تھا۔

اس کے سفر کا دوسرا حصہ پرساپور (موجودہ پشاور) کے پہاڑی علاقے میں

پڑتا ہے، جس کی خاصیت تم وسطی ایشیا کے نقشے سے بہ آسانی معلوم کر سکتے ہو۔ قراقرم، ہندوکش اور ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے اسی خطے میں ملتے ہیں، اور ان پہاڑی علاقوں میں فاہیان نے تقریباً چار سو میل کا راستہ بیس ہزار فیٹ کی بلندی پر طے کیا، لیکن کہیں تم یہ نہ سوچنے لگو کہ اس کو ان علاقوں میں کھانے پینے کی چیزوں اور ٹھیرنے کی جگہوں کی تکلیف ہوئی ہو گی۔ تم کو یہ معلوم کر کے یقیناً تعجب ہو گا کہ ان پہاڑی علاقوں میں بودھ مذہب کے پجاریوں نے بے شمار خانقاہیں بنا رکھی تھیں اور ان میں ہزاروں راہب رہتے تھے اور اپنے مذہب اور عقیدے کی اشاعت کرتے تھے۔ انڈس اور اس کی تمام شاخوں جھیلم، کابل، سوات اور اس کی شاخوں اور آبشاروں کی وادیوں میں خانقاہیں قائم تھیں، جو مسافروں کے لیے کھانا کپڑا پناہ اور تعلیم و تربیت کا سامان مہیا کرتی تھیں۔ ان علاقوں میں ایسی اچھی تہذیب اور شائستگی دیکھ کر فاہیان کو بہت حیرت ہوئی۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے اس حصے کے متبرک مقامات گندھر، ٹکشلا، پرشاپورا اور ہرا کی زیارت کی۔ انھوں نے یہاں پانچ چھے مہینے تک قیام کیا۔ اس زمانے میں انھوں نے وہاں کے ضروری رسوم بھی ادا کیے۔ اس کے بعد اس نے انڈس ندی کو پار کیا اور یکے بعد دیگرے متھرا، قنوج، ساکٹ کوشاں، نہر واسطی، کپل وستو، ویشالی، پاٹلی پتر، نالندہ، گیا، کاشی اور وسطی ہند کی سیر کی۔ وسطی ہند میں وہ مہایانا خانقاہ میں بھی گیا اور تین سال تک بے شمار مذہبی کتابوں کی نقل اور ترجمہ کرتا رہا۔ یہاں سے وہ پھر پاٹلی پتر (پٹنہ) لوٹا اور یہاں بھی تقریباً تین سال تک کتابیں نقل اور ترجمہ کرتا رہا۔ یہ کتابیں اُس نے پاٹلی پتر کے علاوہ نالندہ، چمپا (بھاگل پور) اور تمرالپتی سے حاصل کی تھیں۔ اس زمانے میں تمرالپتی بندرگاہ تھا، مگر آج کل یہ شمالی اڑیسہ کے ساحل سے تقریباً ساٹھ میل کی دُوری پر واقع ہے۔ یہاں سے ایک کشتی میں سوار ہو کر وہ لنکا گیا اور وہاں اپنے مذہبی اور ادبی کاموں کے سلسلے میں دو سال تک رُکا رہا، آخر کار جاوا کو جانے والے جہاز میں بیٹھ کر اس نے لنکا کو خیر باد کہا۔ یہ جہاز راستے ہی میں تباہ ہو گیا اور فاہیان کو بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح وہ جاوا پہنچ گیا اور یہاں اس نے پانچ سال تک قیام کیا۔ اس زمانے میں جاوا میں ہندو مذہب کا دَور دَورہ تھا اور بودھ مذہب کا کوئی پیرو مشکل ہی سے ملتا تھا۔ جاوا سے وہ سنگ چاؤ چلا گیا۔ سنگ چاؤ چین کے شمالی ساحل کی ایک

بندرگاہ ہے اور جاوا سے یہاں تک کا سفر اُس نے تین مہینے میں طے کیا۔

چانگ آن سے وسطی ہند کی خانقاہوں تک جانے میں چھے سال لگ گئے۔ چھے سال تک وہ ہندستان میں رہا اور تمرالپتی سے سنگ چاؤ جانے میں پھر تین سال لگے۔ میرا خیال ہے کہ آج کل شاید ہی کوئی آدمی محض مذہبی کتابوں کے نسخے جمع کرنے اور مذہبی کتابیں نقل اور ترجمہ کرنے اور دُور دراز کے ملکوں اور تیرتھ گاہوں کی سیر کرنے کے لیے پندرہ سال تک گھر بار اور عزیز و اقارب کی خیر خیریت معلوم کیے بغیر ایسی مصیبتیں اور تکلیفیں برداشت کر کے اِتنے دُور دراز کے مقامات کا سفر کرے گا۔

فاہیان کے بعد ایک اور چینی سیاح ہیُن تسانگ ہندستان آیا اور سترہ سال تک یہاں کی کتابوں کا مطالعہ نقل اور ترجمہ کرتا رہا۔ اس مشہور سیّاح کے حالات تم کو پھر کبھی بتائیں گے۔

قوسِ قزح

جب بارش یا کہر کے ننھے ذرات ہوا میں ٹنگے رہ جاتے ہیں اور سورج کی کرنوں کو منعکس کرتے ہیں تو ہمیں قوسِ قزح نظر آتی ہے۔ اگر کسی منشور میں سے سفید روشنی گزاری جائے تو وہ بھی ٹوٹ کر سات رنگوں میں تقسیم ہو جاتی ہے: سُرخ، نارنجی، زرد، سبز، نیلا، کاہی اور بنفشی۔ قوسِ قزح میں بھی یہی سات رنگ نظر آتے ہیں، لیکن ہم اُنھیں الگ الگ نہیں دیکھ سکتے، کیوں کہ سب رنگ آپس میں ملے جُلے رہتے ہیں۔ ہمیں صرف سُرخ، زرد اور نیلا رنگ نظر آتا ہے۔

جس طرح سورج کی شعاعوں سے قوسِ قزح پیدا ہوتی ہے، اُسی طرح چاند کی شعاعوں سے بھی رنگوں کا یہ خوب صورت مجموعہ تیار ہو جاتا ہے۔ چونکہ چاندنی دھوپ کے مقابلے میں پھیکی اور کمزور ہوتی ہے، اس لیے قمری قوس اکثر دکھائی نہیں دیتی۔ اگر رات کو بارش ہو کر تھم جائے اور چاند اُفق پر تیزی سے چمک رہا ہو تو رنگوں کا یہ خوب صورت مجموعہ نظر آجاتا ہے یا پھر رات کے وقت آبشار پر دکھائی دیتا ہے۔



توتے اور بِلّی کا میل

تم سب یہ بات جانتے ہو کہ بلّی چڑیوں
ی قدرتی طور پر دشمن ہوتی ہے۔ جن گھروں میں
بوتر پلے ہوئے ہیں، انھوں نے دیکھا ہوگا کہ بلی
ات یا دن کو جب بھی اُس کو موقع ملتا ہے، چور
طرح مرغیوں اور کبوتروں کے دڑبے میں چلی
اتی ہے اور وہاں جا کر کبوتر، مرغی یا اس کے انڈے
بھی مِل جائیں اُن کا صفایا کر دیتی ہے اور کبھی
بھی دڑبے کے اندر گھُس کر کبوتر کے بچّے کو مار کر
جاتی ہے۔

بلّی درختوں پر چڑھ کر چڑیوں کو پکڑ لیتی
ہے۔ بعض بلیاں پرندوں کے پنجرے کے اندر
پنجہ ڈال کر پکڑنے کی کوشش کرتی ہیں۔ پرندے
بے چارے زور زور سے ٹیں ٹیں، چوں چوں کرتے
رہ جاتے ہیں۔ پرندوں کی دردناک چیخ و پکار
سُن کر لوگ سوتے ہوئے بھی جاگ جاتے ہیں بعض
لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ پرندہ یونہی بول رہا ہے۔
وہ سوتے ہی رہتے ہیں اور صبح کو جب آنکھ کھلتی
ہے تو دیکھتے ہیں کہ بلی کے ناخونوں سے گھائل ہو کر
پرندہ پنجرے کے اندر مرا پڑا ہے۔ اب ہم تمھیں
ایک عجیب خصلت بلّی کی سچی کہانی سُناتے ہیں۔

ڈھاکہ سے چند میل کے فاصلے پر ایک
چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس میں ایک کسان رہتا تھا

اُس کے پاس ایک توتا تھا۔ وہ بہت پیاری پیاری باتیں کرتا تھا۔ اُس کسان کے پاس ایک بلّی بھی تھی۔ توتا اور بلی دونوں تمام دن اکٹھے رہتے تھے۔ توتے کو کسان کی بیوی کچھ کھانے کو ڈالتی تو وہ اپنی چونچ میں لے کر بلی کے پاس جا کر اُس کے سامنے رکھ دیتا۔ اگر بلّی کو کسان کی بیوی پیالی میں دودھ دیتی تو وہ میاؤں میاؤں کر کے توتے کو بُلاتی، جب تک توتا نہ آتا، بلّی دودھ نہ پیتی۔ اس طرح توتے کو کچھ کھانے کو دیا جاتا اور بلی توتے کے پاس نہ آتی تو توتا نہ کھاتا۔ ایک روز شام کا وقت تھا۔ گھر میں کوئی شخص نہ تھا۔ کسان کسی کام سے شہر گیا ہوا تھا۔ کسان کی بیوی اپنے ہمسائے کے گئی ہوئی تھی۔ توتا اور بلی دونوں کھیل رہے تھے۔ پاس ہی ایک برتن میں میدہ پانی میں بھیگا ہوا رکھا تھا۔ توتے میاں کھیلتے کھیلتے اُس میں جا گرے اب وہ جتنی کوشش باہر نکلنے کی کرتا اُس کے پیر میدے میں اُتنا ہی زیادہ دھنستے جاتے تھے۔ بلّی پریشان میاؤں میاؤں کرتی تمام گھر میں پھر رہی تھی۔ آخر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور گھبرا کر ہمسائے کے ہاں میاؤں میاؤں کرتی چلی گئی۔ وہاں پر اس کو کسان کی بیوی مل گئی۔ وہ اس کی ساڑھی کا سِرا پکڑ کر گھر لے جانے کے لیے کھینچنے لگی۔ کسان کی بیوی حیران تھی کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ بلی کیوں بے چین ہے۔ چُناں چہ معلوم کرنے کے لیے وہ بلی کے ساتھ گھر آئی۔ وہاں جا کر اُس نے دیکھا کہ توتے زور زور سے اپنے پَر پھڑ پھڑا رہے ہیں اور میدے میں اس طرح دونوں پاؤں دھنس گئے ہیں کہ کسی طرح باہر نہیں نکل سکتے، بلکہ دم بہ دم نیچے دھنستا جا رہا ہے۔ اگر وہ ذرا اور نیچے کو ہو جاتا تو اُس کی جان ہی نکل جاتی ہے، لیکن اُس کے بے زبان ساتھی نے اُسے مصیبت میں دیکھ کر اُس کی ننھی سی جان بچانے کی ترکیب ڈھونڈ نکالی۔ اس کی مالکن نے جلدی سے اُسے پکڑ کر باہر نکالا، تب بے چارے کی جان میں جان آئی۔ دیکھا تم نے، اگر بلّی اس طرح کسان کی بیوی کو بُلا کر نہ لاتی اور اس کے بچاؤ کی صورت نہ نکال لیتی تو غریب توتا میدے ہی میں دھنس کر مر چکا ہوتا۔

کیوں بھئی، کبھی تم نے بھی ایسی نیک اور ہمدرد بلّی دیکھی یا سُنی ہے، جو اپنے ساتھی پر پڑنے کی مصیبت میں اس طرح کام آئے اور اُس کی جان بچائے۔ یہ بلی بھی اگر عام بلیوں کی طرح ہوتی، تو توتے کو اس طرح اپنے سامنے دیکھ کر چٹ ہی کر جاتی۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انسانوں کی طرح جانوروں میں بھی مختلف عادت خصلت کے جانور ہوتے ہیں۔



واقعی تم خوش بخت لڑکے ہو

بہت دن ہوئے ایک غریب کسان کے گھر میں ایک بچہ ہوا۔ یہ بچہ اتنا خوب صورت تھا کہ گاؤں کی بڑی بوڑھیوں نے جب اسے دیکھا تو طرح طرح کی پیش گوئیاں کرنے لگیں ایک بڑی بی بولیں، "یہ بڑا خوش نصیب ہوگا۔" دوسری بولیں، "بے شک، یہ جب بڑا ہوگا تو شاہ زادی کے ساتھ شادی کرے گا۔" غرض اس بچے کے متعلق اسی طرح کی باتیں مشہور ہوگئیں۔

اتفاق کی بات کہ چند روز بعد بادشاہ بھیس بدلے ہوئے اسی گاؤں سے گزرا۔ لوگ بادشاہ کو پہچان نہ سکے۔ بادشاہ اکیلا چلا جا رہا تھا کہ اتنے میں اُسے گاؤں کا ایک بڈھا ملا۔ بڈھا بادشاہ کو گاؤں کا معمولی آدمی سمجھ کر بولا، "ارے بھائی، تم نے بھی اس خوش نصیب بچے کو دیکھا یا نہیں؟ لوگ کہتے ہیں کہ یہ بچہ اتنا خوش بخت پیدا ہوا ہے کہ بڑا ہو کر شاہزادی کو بیاہ لائے گا۔" یہ سُن کر بادشاہ بڑا پریشان ہوا اور اس نے اپنے دل میں یہ تہیہ کر لیا کہ میں اس دہقان کے بچے کو جیتا ہی نہ چھوڑوں گا جو بڑا ہو کر میری بیٹی سے شادی کر سکے۔ چناں چہ بادشاہ اس کسان کے گھر پہنچا اور کہنے لگا، "میں نے سُنا ہے کہ تمھارا بچہ اتنا خوش نصیب پیدا ہوا ہے کہ

بڑا ہو کر شاہزادی کے ساتھ شادی کرے گا؟"
کسان نے کہا، "ہاں بھائی، لوگ تو یہی کہتے ہیں۔" اس پر بادشاہ بولا، "مگر کیا تمھارے پاس اتنی دولت بھی ہے، جو تم اپنے بچے کی پرورش شاہزادوں کی طرح سے کر سکو گے؟"

کسان نے بڑے افسوس سے کہا، "نہیں بھائی، ہم لوگ تو بیحد غریب ہیں۔" بادشاہ بولا، "دیکھو، میں ایک رئیس آدمی ہوں۔ تم اپنے بچے کو مجھے دے دو۔ میں بالکل شہزادوں کی طرح اس کی پرورش کروں گا، تاکہ جب یہ بڑا ہو جائے تو شاہزادی کے ساتھ شادی کر سکے۔" یہ سنتے ہی بچے کے ماں باپ دونوں ایک زبان ہو کر بول اٹھے، "نہیں، نہیں، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔" لیکن تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد بادشاہ نے ان لوگوں کو بہت سا سونا چاندی دے کر آخر کار راضی کر لیا اور بادشاہ اس بچے کو لے کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور وہاں سے چل دیا۔ ماں اپنے بچے کو جاتے ہوئے دیکھ کر رونے لگی۔ کسان نے اپنی بیوی کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا، "بیوی اتنا پریشان نہ ہو۔ ہمارا بچہ بڑا خوش نصیب ہے۔ وہ ہر طرح کی بلاؤں سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔"

بادشاہ بچے کو لے کر جب بہت دور نکل گیا تو راستے میں ایک دریا ملا۔ بادشاہ نے سوچا کہ یہ جگہ اچھی رہے گی۔ چناں چہ وہ فوراً گھوڑے پر سے اتر پڑا اور اس نے بچے کو ایک ٹوکری میں لٹا دیا، پھر اس ٹوکری کو دریا میں بہا دیا۔ اس کے بعد خوش ہو کر سوچنے لگا کہ اب یہ خوش بخت بچہ قیامت تک بھی میری بیٹی سے شادی نہ کر سکے گا۔

ادھر اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ ٹوکری بہتے بہتے بہت دور نکل گئی اور دریا کے دوسرے کنارے کے قریب جو پہنچی تو وہاں پر ایک لڑکا بیٹھا ہوا مچھلی کا شکار کھیل رہا تھا۔ لڑکے نے جو ٹوکری دیکھی تو اس نے لپک کر ٹوکری کو دریا میں سے گھسیٹ لیا۔ اب جو دیکھتا ہے تو اس میں ایک چھوٹا سا خوب صورت بچہ پڑا ہوا ہے۔ یہ لڑکا ایک کارخانے دار کے پاس ملازم تھا، لہٰذا وہ ٹوکری اٹھا کر بھاگتا ہوا سیدھا اپنے مالک کے گھر پہنچا۔ کارخانے دار اور اس کی بیوی کے کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی تھی۔ چناں چہ یہ دونوں اس بچے کو دیکھ کر نہال ہو گئے اور اسے اپنی اولاد کی طرح پرورش کرنے لگے۔ ان لوگوں نے اس بچے کا نام

بدر رکھ دیا۔

وقت گزرتا گیا اور بدر ایک نہایت حسین جوان ہو گیا۔ ایک رات بڑے زور و شور کی بارش ہونے لگی۔ بدر نے کھڑکی میں سے باہر دیکھتے ہوئے کہا، "ماں، آج تو خوب پانی برس رہا ہے۔" ماں نے کہا، بیٹا، آج جو بیچارے لوگ اپنے گھر کے باہر ہوں گے اُن کے لیے بڑی پریشانی ہو رہی ہو گی۔" عین اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔ ماں بولی، "بھلا اتنی رات گئے کون آیا ہے؟" بہرحال جب دروازہ کھولا تو دیکھا کہ بادشاہ سلامت کھڑے ہوئے ہیں۔ بادشاہ نے کہا، "بڑی بی، آج رات مجھے تمھارے ہی گھر میں قیام کرنا پڑے گا۔ اس طوفان سے نجات ملے تو پھر میں روانہ ہو سکوں گا۔" چُناں چہ بادشاہ کے لیے جلدی جلدی ایک پلنگ و بستر وغیرہ کا انتظام کیا اور بدر بادشاہ کا گھوڑا لے کر اصطبل کی طرف روانہ ہوا۔ بدر کو دیکھ کر بادشاہ نے کارخانے دار کی بیوی سے پوچھا،

"یہ حسین نوجوان کیا تمھارا ہی بیٹا ہے؟" اس پر کارخانے دار کی بیوی بولی، "جی نہیں، یہ تو ہمیں دریا میں بہتا ہوا مل گیا تھا۔ اس وقت یہ بہت چھوٹا تھا۔ بیچارہ ایک ٹوکری میں پڑا ہوا بہتا چلا جا رہا تھا۔"

یہ سُن کر بادشاہ بیحد متفکر ہو گیا۔ وہ اپنے دل میں سوچنے لگا کہ ارے یہ تو وہی خوش بخت بچہ ہے۔ مجھے فوراً اُسے ٹھکانے لگا دینا چاہیے۔

چُناں چہ جتنی دیر میں بدر اصطبل سے واپس لوٹا اتنی ہی دیر میں بادشاہ نے ایک ترکیب سوچ لی اور جب بدر اس کے سامنے آیا تو بادشاہ بولا، "مجھے اپنی ملکہ کے پاس ایک ضروری خط بھیجنا ہے۔ کیا تم یہ کام کر سکو گے؟"

بدر نے کہا، "جہاں پناہ، میں بڑی خوشی سے یہ خدمت انجام دے لوں گا۔" یہ سُن کر بادشاہ بڑا خوش ہوا اور کہنے لگا، میں تمھیں اس خدمت کے صلے میں بہت سا انعام دُوں گا۔" اس کے بعد بادشاہ نے حسبِ ذیل خط لکھا:

اس نوجوان سے جو کہ خط لے کر آرہا ہے ہماری بیٹی کے لیے ایک زبردست خطرہ ہے، لہٰذا جوں ہی یہ پہنچے اسے گرفتار کر کے کسی دُور دراز مقام پر بھجوا دو۔"

خط بدر نے اپنی جیب میں رکھا اور اسی آندھی پانی میں نکل پڑا۔ رخصت

ہوتے وقت اُس کی منھ بولی ماں نے سینکڑوں دُعائیں دیں، مگر بادشاہ اپنے دل میں یہی خوشی منا رہا تھا کہ بدر جلد جہنم واصل ہو جائے، تاکہ آئندہ اس کی پھر صورت نہ دیکھنا پڑے۔ چُوں کہ رات کا وقت تھا اور بارش بھی بڑے زوروں سے ہو رہی تھی، لہٰذا بدر جنگل میں راستہ بھُول گیا۔ شاہی محل جانے والی سڑک اسے نہ مل سکی۔ بہر حال تھوڑی دُور جانے کے بعد اُسے ایک چھوٹا سا مکان دکھائی دیا۔ بدر نے مکان پر دستک دی۔ ایک ضعیفہ نے کھڑکی کھول کر پوچھا، "کون ہے؟" بدر نے کہا، "میں ملکہ کے نام ایک خط لیے جا رہا ہوں، لیکن طوفان کی وجہ سے راستہ بھُول گیا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو آج رات آپ کے مکان میں قیام کر لوں۔" ضعیفہ کو بدر پر ترس آ گیا اور اُس نے بدر کو فوراً اندر بُلا لیا۔ رات کو جب بدر سو گیا تو ضعیفہ کو اس خط کا خیال آیا، جو بدر لیے جا رہا تھا۔ چُوں کہ اس ضعیفہ نے بادشاہ کا خط ملکہ کے نام کبھی دیکھا ہی نہ تھا، اس لیے اُسے بڑا اشتیاق پیدا ہو گیا کہ کسی طرح سے اس خط کو ایک نظر دیکھ لیا جائے۔ خط بدر کے کوٹ میں تھا۔ سوتے وقت بدر نے کوٹ ٹانگ دیا تھا۔ ضعیفہ دبے پاؤں بدر کے پلنگ کے قریب پہنچی اور چپکے سے جیب میں سے وہ خط نکال لیا، مگر جب ضعیفہ نے اس خط کو پڑھا تو وہ بےحد پریشان ہو گئی اور اپنے دل میں کہنے لگی "ارے یہ لوگ تو اس غریب نوجوان کی جان ہی لینے پر تُلے ہوئے ہیں۔" ضعیفہ نے جلدی سے ایک دوسرا کاغذ لیا اور اس پر لکھا:

"یہ نوجوان جو خط لے کر آ رہا ہے میرا خاص آدمی ہے۔ اس کی خوب خاطر مدارات کرو اور فوراً شاہزادی کی شادی اس نوجوان کے ساتھ کر دو۔" پھر اس نے بادشاہ کے لکھے ہوئے خط کو تو جلا ڈالا اور اپنے لکھے ہوئے خط کو بدر کی جیب میں رکھ دیا۔

دوسرے دن صبح بدر ضعیفہ کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوا۔ یہ دیکھ کر ضعیفہ بڑی خوش ہوئی کہ بدر کو خط کی تبدیلی کے بارے میں قطعی کوئی خبر نہیں۔ چند گھنٹوں کی مسافت کے بعد بدر شاہی محل پہنچ گیا۔ پھاٹک پر سپاہی نے جب روکا تو بدر نے کہا کہ مجھے ملکہ کو ایک خط پہنچانا ہے۔ سپاہی نے جلدی سے پھاٹک کھول دیا اور بدر سیدھا ملکہ کے پاس پہنچا دیا گیا۔ ملکہ نے خط لے کر پڑھا اور پڑھنے کے بعد بےحد خوش ہو کر بولی، "اچھا برخوردار، تو تم شاہزادی سے شادی کرنے آئے ہو!" یہ سُن کر بدر بالکل

ہکا بکا رہ گیا۔ ملکہ نے فوراً شاہزادی کو بلوا بھیجا اور جب وہ آگئی تو اُس سے کہا، "ابھی ابھی بادشاہ سلامت کا خط آیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ کل تمھاری شادی اس نوجوان کے ساتھ کر دی جائے۔" بدر اور شاہزادی دونوں سر جھکائے کھڑے سنتے رہے۔

دوسرے دن صبح کے وقت بدر اور شاہزادی کی شادی کر دی گئی مگر رات کو جب دعوت ہو رہی تھی تو بادشاہ بھی واپس آگیا۔ شاہزادی اور بدر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ بادشاہ نے جُوں ہی بدر کو دیکھا تو وہ حیران ہو کر پوچھنے لگا، "یہ لڑکا یہاں کیا کر رہا ہے؟" ملکہ نے نہایت سکون سے جواب دیا، "آپ کے حکم کے مطابق اس لڑکے کی شادی شاہزادی سے کر دی گئی ہے۔" اب تو بادشاہ بڑا سٹ پٹایا۔ کہنے لگا، "نہیں، نہیں، میں نے تم سے یہ کب کہا تھا۔" اس پر ملکہ نے وہ خط نکال کر دکھایا۔ خط دیکھ کر بادشاہ بولا، "یہ خط تو تبدیل کر دیا گیا ہے۔" پھر بادشاہ بدر پر برس پڑا، "سچ سچ بتاؤ کہ کیا یہ کام تم نے کیا؟" بدر بولا، "مجھے اس کے متعلق قطعی کوئی علم نہیں۔ ممکن ہے کہ جب میں سو رہا تھا اُس وقت کسی نے خط بدل دیا ہو۔"

بادشاہ کا غصّہ اُس وقت دیکھنے والا تھا۔ آخر کار وہ بولا، "خیر قسمت کا لکھا ہوا تو پورا ہو ہی گیا، مگر میں تمھیں اتنی آسانی سے نہ چھوڑوں گا۔ شادی تو ہو گئی، مگر میں تمھیں اس وقت تک شاہزادی کے لائق نہ سمجھوں گا جب تک کہ تم کوئی کارنمایاں نہ دکھالو۔"

بدر نے کہا، "میں بہ خوشی تیار ہوں۔ آپ حکم دیں۔" اس پر بادشاہ نے کہا، "میں چاہتا ہوں کہ تم اس سنہرے بالوں والے دیو کے سر سے تین بال اکھاڑ لاؤ اور دیکھو یہ کام آج ہی رات میں ہو جائے۔"

بدر نے کہا، "جہاں پناہ، میں کسی دیو دیو سے نہیں ڈرتا، میں ابھی جاتا ہوں۔" چناں چہ تھوڑی ہی دیر میں وہ شہزادی سے رخصت ہو لیا اور چلتے وقت کہہ گیا، "شاہزادی صاحبہ، آپ پریشان نہ ہوں میں آپ کے والد صاحب کو یہ دکھا دوں گا کہ میں ان کی فرزندی کے لائق ہوں۔" جب بدر روانہ ہو گیا تو بادشاہ اپنے دل میں سوچنے لگا کہ آج میں اسے تیسری بار موت کے منھ میں بھیج رہا ہوں اب کی بار شاید یہ زندہ نہ لَوٹ سکے۔

بدر جُوں ہی شہر پناہ کے پھاٹک پر پہنچا

تو سپاہی نے اُسے للکارا، "کہاں جا رہے ہو؟"
بدر نے جواب دیا، "میں سنہرے بالوں والے دیو کے مُلک میں جا رہا ہوں۔"

اس پر بوڑھا سپاہی بولا، "میاں صاحبزادے، تمھاری طرح کے بہت سے نوجوان اس دیو کے ملک میں گئے، مگر لوٹ کر ایک بھی نہ آیا۔"

بدر نے برجستہ کہا، "لیکن میں واپس آجاؤں گا۔ اچھا خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر وہ روانہ ہوگیا۔ پھر چلتے چلتے وہ ایک بڑی سی جھیل کے کنارے پہنچا، یہاں ایک ملاح اپنی کشتی لیے بیٹھا ہوا تھا۔ بدر نے اس سے پوچھا، "اس کنارے تک پہنچانے کے لیے کتنے پیسے لوگے؟"

ملاح بولا، "دوگنے دام دینا ہوں گے، یعنی آنے جانے دونوں ہی طرف کے دام دینا پڑیں گے۔"

بدر نے کہا، "آخر یہ کیوں؟" اس پر بڈھا ملاح بولا، "بات یہ ہے کہ بہت سے نوجوان جھیل کو پار کر کے اس سنہرے بالوں والے دیو کے ملک میں چلے تو گئے، مگر اُس کنارے سے ادھر آنے کے لیے مجھے کبھی ایک بھی مسافر نہ ملا۔"

یہ سُن کر بدر بولا، "میں تو تمھیں ابھی صرف جانے کا کرایہ دُوں گا، کیوں کہ میں انشاء اللہ آج ہی رات کو واپس بھی آجاؤں گا۔"

اس پر ملاح بولا، "میاں اگر تم آج ہی رات لوٹ آؤ تو میں تمھیں ایک تھیلی اشرفی بطور انعام دے دوں گا۔" اس کے بعد بدر کشتی میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ راستے میں اُس نے ملاح سے کہا،

"دیکھو اپنا وعدہ یاد رکھنا۔" کشتی جب دوسرے کنارے پر پہنچ گئی تو بدر نے ملاح سے کہا، "اتنا اور بتا دو کہ اس دیو کا مکان ہے کس طرف؟" ملاح نے ہاتھ کے اشارے سے کہا، "اُس طرف۔" پھر بولا "اچھا خدا حافظ، اللہ تم کو کامیاب کرے۔"

بدر کشتی سے اُتر کر جنگل میں چل پڑا۔ رات اندھیری تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ بدر گھبرانے لگا کہ کہیں راستہ نہ کھو بیٹھے، مگر اچانک تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک بہت بڑے سے محل کے پاس پہنچ گیا۔ بدر نے سمجھ لیا کہ ہو نہ ہو یہی اس دیو کا مکان ہوگا۔

محل کا دروازہ بند تھا اور دروازے کا کنڈا اتنے اونچے پر لگا ہوا تھا کہ بدر وہاں

تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ چناں چہ اس نے دروازے میں جو جھری تھی اس میں سے داخل ہونے کی کوشش کی اور آخر کار وہ اس میں کامیاب ہوگیا۔ کمرے میں داخل ہو کر اُس نے دیکھا کہ ایک نہایت بڑی سی کرسی پر ایک بڑی بی بیٹھی کچھ بُن رہی ہیں۔ بدر جب اُن کے سامنے جاکر کھڑا ہوا تو ایسا لگا کہ جیسا ایک کبوتر کسی انسان کے سامنے آکر کھڑا ہو جائے۔ بڑی بی کرسی سے جھکیں اور اپنی عینک کے شیشوں کے اوپر سے آنکھیں نکال کر بدر سے بولیں،

"تم یہاں کیسے آئے؟" بدر تیزی سے کُود کر اُون کے اُن گولوں پر کھڑا ہوگیا، جو ایک بڑے سے ناندے میں پڑے ہوئے تھے۔ اسی اُون سے بڑی بی بُن رہی تھیں۔ بدر نے کہا، "کیا آپ ہی سنہرے بالوں والی دیونی ہیں؟" بڑی بی بولیں، "نہیں، میں دیو کی دادی ہوں۔ وہ ابھی گھر میں نہیں ہے۔" بدر نے کہا، "مجھے ان ہی سے کام ہے۔ بات یہ ہے کہ مجھے اُن کے سَر کے تین بال درکار ہیں اور اگر میں یہ حاصل نہ کر سکا تو پھر میری دلہن مجھ سے چھین لی جائے گی۔"

یہ سُن کر بڑی بی کو بڑا ترس آیا۔ کہنے لگیں، "ارے یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔ اچھا ننھے میاں، میں تمھاری مدد کروں گی۔ تم جلدی سے میری جیب میں چھپ جاؤ۔ میرا پوتا اب آنے ہی والا ہے۔" چناں چہ بدر جلدی سے بڑی بی کی جیب میں گھُس گیا۔ اس کے بعد بڑے زور و شور کا ہنگامہ مچنا شروع ہوگیا، جیسے کہ آندھی آئے اور پھر ذرا ہی دیر بعد ایک نہایت قوی ہیکل دیو دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ آتے ہی دیو نے کہا، "دادی اماں، سلام، کھانا تیار ہے نا؟" بڑی بی بولیں، "ہاں، تم بیٹھو، میں ابھی کھانا لائی۔" دیو بولا، "آج کیا پکایا ہے؟ مجھے تو آدم زاد کی بُو آرہی ہے۔" بڑی بی کھانا نکالتے ہوئے بولیں، "یہ تمھارا وہم ہے۔ یہاں آدم زاد کا کہاں گزر۔ اس گھر میں تو مہینوں سے کسی آدم زاد نے قدم نہیں رکھا۔" دیو بولا، "ممکن ہے کسی جگہ کوئی آدمی چھپا ہو۔ مجھے تو آدم زاد کی بُو بالکل صاف صاف آرہی ہے۔" یہ کہتے ہی دیو نے گھر کا ایک ایک کونا چھان مارا۔ اس پر اس کی دادی نے ڈانٹ کر کہا، "بس، شروع کر دی تم نے اُلٹ پلٹ۔ میں دن دن بھر مَر مَر کر ہر چیز کو سنبھالتی رہوں

اور تم یوں ستیاناس کرتے رہو۔"

آخر کار مجبور ہو کر دیو آ کر بیٹھ گیا اور کھانا کھانے لگا۔ اس کی دادی علیحدہ بیٹھی رہیں۔ کھانے کے بعد دیو ایک بہت بڑی آرام کرسی پر دراز ہو گیا اور بولا، "مجھے بڑی نیند آ رہی ہے۔ میں ذرا دیر سوتا ہوں۔"

چناں چہ ذرا ہی دیر میں دیو خراٹے لینے لگا۔ دیو کی دادی نے بدر کو اپنی جیب سے نکال کر اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا اور بولی، "دیکھو اگر اس وقت میں اسے جگاتی ہوں تو یہ بڑا ناراض ہو جائے گا۔ تم کل تک ٹھہر جاؤ۔"

بدر بولا، "مگر مجھے تو آج ہی رات واپس پہنچنا ہے۔ کل تک تو میں بالکل تباہ ہو جاؤں گا۔ آپ کے پوتے صاحب تو اتنے بڑے ہیں کہ اگر اُن کے سر کے چند بال میں اکھاڑ لوں تو اُنھیں کچھ محسوس بھی نہ ہو گا۔"

بڑی بی بولیں، "اچھا تو پھر آؤ، کوشش کریں۔"

یہ کہہ کر بڑی بی دیو کے پیچھے کھڑی ہو گئیں اور لگیں اس کے سر کے بال توڑنے۔ اس وقت بدر بڑی بی کے شانے پر بالکل ایک طوطے کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ بڑی بی نے ایک ہی بال توڑا تھا کہ دیو بڑے زور سے چلاّ اُٹھا:

"اُفوہ!" بدر جلدی سے بڑی بی کی پیٹھ پر چپک گیا۔ دیو نے اپنی دادی سے پوچھا، "یہ کیا ہوا تھا؟"

بڑی بی بولیں، "کچھ بھی نہیں، تم نے کوئی خواب دیکھا ہو گا۔ تم سوتے ہیں ابھی یہ چلائے تھے کہ تمھارے سر میں بھڑیں کاٹ رہی ہیں۔" یہ کہہ کر بڑی بی دیو کے بالوں میں کنگھی کرنے لگیں اور بولیں، "لاؤ، میں ذرا تمھارے بال سنوار دوں۔"

دیو بولا، "ہاں ہاں، کنگھی کرنے سے مجھے بڑی جلدی نیند آ جاتی ہے۔" اس کے بعد دیو پھر سو گیا، مگر بڑی بی نے پھر ایک بال توڑ لیا۔ بال اکھاڑنا تھا کہ دیو پھر چیخ اُٹھا، "اُفوہ!" اور کھڑا ہو گیا۔ اس کی دادی کنگھی ہاتھ میں لیے جلدی سے بول اُٹھیں، "سوتے میں تمھارے بال کنگھی میں اُلجھ رہ گئے تھے، میں انھیں نکال رہی تھی۔"

دیو بولا، "اب کی بار تم نے مجھے جگایا تو پھر تمھارا بھُرتہ بنا دوں گا۔" یہ کہہ کر دیو پھر سو گیا۔ بڑی بی نے جلدی سے بدر کو اپنی ہتھیلی پر کھڑا کیا اور بولیں، "دیکھا تم نے، دو بال لینے میں تو یہ نوبت آ گئی ہے

اب تیسرا بال تم کل لینا۔"

اس پر بدر بولا، "لیکن اگر آج ہی رات میں تینوں بال لے کر نہ لوٹا تو پھر میری دلہن چھین لی جائے گی۔"

آخر کار بڑی بی پھر راضی ہو گئیں اور اُنھوں نے موقع پاکر ایک بال اور توڑ لیا۔ دیو چیختا ہوا جاگ اُٹھا اور دانت کٹ کٹا کر بولا، "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ اب مجھے نہ جگانا۔"

بڑی بی بولیں، "بات یہ ہوئی کہ تمھارے بالوں میں ایک مکھی پھنس گئی تھی۔ میں اسی کو نکال رہی تھی"

اس کے بعد دیو کو اسی جگہ کرسی پر لٹا کر بڑی بی جلدی سے باہر آ گئیں اور بدر کو اپنی جیب سے نکال کر اپنی ہتھیلی پر کھڑا کیا۔ پھر وہ تینوں بال باندھ کر اس کے سپرد کیے۔ بدر نے شکریہ ادا کیا اور بولا، مگر آپ کے ساتھ اب وہ نہ جانے کیا بدسلوکی کرے۔" بڑی بی بولیں، "تم اس کی فکر نہ کرو۔ وہ ابھی پھر سو جائے گا اور ساری باتیں بھول جائے گا۔" پھر بڑی بی نے بدر کو سنبھال کر نیچے زمین پر چھوڑ دیا اور کہا، "اچھا اب تم اپنے گھر جاؤ۔"

بدر اس دیو کی دادی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہو گیا۔ جھیل کے کنارے اُسے وہی ملاح ملا۔ بدر نے اُس سے کہا، "دیکھا، میں واپس آ گیا۔" ملاح نے اسے اپنی کشتی میں بٹھایا اور پار اُتار دیا۔ پھر حسبِ وعدہ اسے ایک تھیلی اشرفیوں کی بھی دے دی۔ بدر جب شہر پناہ کے پھاٹک پر پہنچا تو اُسے وہی بوڑھا سپاہی ملا۔ بدر نے اس سے کہا، "دیکھو میں آ گیا۔" سپاہی بولا، "واقعی تم خوش نصیب ہو۔"

محل پر پہنچ کر بدر نے بادشاہ کے سامنے دیو کے بال پیش کر دیے اور اس کے ساتھ ساتھ اشرفیوں کی وہ تھیلی بھی بطور نذرانہ پیش کر دی۔ یہ سب چیزیں دیکھ کر بادشاہ بیحد متاثر ہوا اور بولا، "واقعی مان گیا۔ تم یقیناً بڑے خوش بخت لڑکے ہو۔ اب میں تمھیں کبھی کوئی زحمت نہ دُوں گا۔"

اس کے بعد بدر شاہزادی کے پاس گیا۔ وہ باغ میں اس کی منتظر ہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے مل کر بیحد خوش ہوئے، پھر بدر نے اپنے والدین کو بھی اپنے پاس بُلوا لیا اور اس کارخانے دار اور اس کی بیوی کو بھی بُلوا لیا، جنھوں نے اس کی پرورش کی تھی اور سب لوگ نہایت ہنسی خوشی رہنے لگے۔



کچھ کہو کچھ سنو

شمیلہ فرخ ——— مستونگ

س : بچوں کے غیر ملکی اُردو ادیبوں کے نام تو بتائیے؟

ج : حامد اللہ افسر، کرشن چندر، واجدہ تبسم شفیع الدین نیرّ، عصمت چغتائی، جیلانی بانو

محمد ارشاد حسین صدیقی ——— سکھر

س : آپ رسالے میں اخباری کاغذ کے بجائے سفید کاغذ کیوں نہیں استعمال کرتے؟

ج : سفید کاغذ ملنے لگے تو بڑی خوشی سے ہم نونہال کو زیادہ سفید بنائیں گے۔

شہناز ——— سلہٹ

س : بھائی جان، مجھے نیند نہ آنے کی شکایت ہے کوئی علاج بتائیے؟

ج : جب نیند نہ آئے کورس کی کتابیں پڑھنے لگا کرو۔

رئیس احمد انصاری ——— کراچی

س : کیا ہمدردِ صحت بھی آپ کے ہاں سے شائع ہوتا ہے، اس کا سالانہ چندہ کیا ہے؟

ج : جی ہاں، ہمدرد صحت بھی اسی ادارہ سے شائع ہوتا ہے۔ ہمدرد صحت کی سالانہ قیمت ۱۵ روپے ہے۔

کلیم فاروقی ـــــ لاڑکانہ

س : دنیا کا سب سے بڑا ریلوے اسٹیشن کہاں ہے ؟

ج : دنیا میں سب سے بڑا ریلوے اسٹیشن گرینڈ سنٹرل ٹرمینل نیویارک ہے ۔

نعیم انور ـــــ سکھر

س : پچھلے شمارے میں آپ نے کراچی کی سیر کا وعدہ کیا تھا، کب پورا کر رہے ہیں؟

ج : ہم اپنے وعدے کے پورے ہیں ۔ تم کراچی کی سیر کر سکتے ہو۔

محمد اختر متین ـــــ کوٹ سماںبہ

س : پاکستان کے صحت افزا مقامات تو بتایئے؟

ج : کاغان، گلگت، سوات، چترال، ہنزہ، اسلام آباد، مری، کوئٹہ، زیارت

حاجی عبدالخالق ہارون ـــ گوادر

س : سب سے پہلے ہوائی جہاز کس نے ایجاد کیا؟

ج : ۱۹۰۳ء میں رائٹ برادران نے (موٹر والا) ہوائی جہاز ایجاد کیا، بعد میں دوسرے لوگوں نے اس کو ترقی دی، پھر ۱۹۳۹ء میں وہٹل نے جیٹ انجن بنایا، جو آج کل استعمال میں آتے ہیں ۔

ریاض احمد شہزاد ـــــ حیدر آباد

س : نونہال ہر ماہ کس تاریخ کو شائع ہوتا ہے؟

ج : نونہال ہر ماہ کی بیس ۲۰ تاریخ کو شائع ہوتا اور بائیس ۲۲ کو ڈاک کے ذریعے روانہ ہوتا ہے۔

خورشید احمد وارثی ـــــ سکھر

س : تعلیم انسان کو کیا سکھاتی ہے ؟

ج : تعلیم انسان کو انسان بننا سکھاتی ہے۔

اخلاق محمود شاہ ـــ فورٹ سنڈیمن

س : ملائشیا کے وزیر اور انڈونیشیا کے صدر کے نام کیا ہیں ؟

ج : ملائشیا کے وزیر کا نام ٹنکو عبدالرحمٰن اور انڈونیشیا کے صدر کا نام احمد سوئیکارنو ہے ۔

محمد صدیق نیاز ـــــ کراچی

س : ذہنی قوت تیز کرنے کا کوئی نسخہ ؟

ج : نونہال کا پابندی سے مطالعہ !

محمد سہیل زبیری ـــــ پشاور

س : آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا شہر کون سا ہے ؟

ج : آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا شہر ٹوکیو (جاپان کا دارالحکومت) ہے۔

محمد ابراہیم صدیقی ـــ ڈیرہ غازی خاں

س : کیا آپ ہمدرد نونہال کا سالنامہ یا خاص نمبر بھی نکالتے ہیں ؟

ج : نونہال کا ہر شمارہ خاص نمبر ہوتا ہے۔

نونہال ادب



بڑھیا نے مگرمچھ مارا

عبدالواحد مجید۔ کراچی



گوہتی نام کی ایک بستی تھی۔ اس بستی کے پاس ہی "برہم پترا" نام کی ندی بہتی تھی۔ جس میں بہت سے مگرمچھ تھے۔ اِن مگرمچھوں میں ایک بہت بڑا مگرمچھ تھا، جو بڑا شریر تھا۔ وہ لوگوں کو بہت ستایا کرتا تھا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ ایک چرواہا بکریاں چرانے لے آیا۔ وہ بکریاں پانی پی رہی تھیں کہ مگرمچھ نے اس میں سے ایک بکری کو پکڑ لیا اور کھا گیا۔ اس کو اس گوشت میں بڑا مزا آیا پھر کیا تھا۔ جب بکریاں اور گائے وغیرہ پانی پینے آتیں تو ان میں سے ایک دو کو اٹھا لے جاتا۔ لوگ اس سے تنگ آ گئے تھے، مگر کر بھی کیا سکتے تھے۔ گایوں اور بکریوں کو ندی پر بھیجنا چھوڑ دیا۔ اور خود جاتے اور ان کے لیے پانی

لے آتے۔

دو تین دن ہو گئے جب مگرمچھ کو کو شکار نہ ملا تو اس نے آدمیوں کو کھانا شروع کر دیا۔ اس سے وہاں کے لوگ بہت پریشان ہوئے۔ اور اس مگرمچھ کو مارنے کی بہت کوششیں کی گئیں، مگر سب ناکام ہوئیں، کیوں کہ اگر مگرمچھ پانی میں ہو تو اس پر گولی چلانا بالکل بے کار ہوتا ہے۔ ہاں مگرمچھ کو دھوپ بہت پسند ہے۔ اس لیے صبح ہی سے جب سورج نکلے تو سب مگرمچھ کنارے پر آکر دھوپ میں پڑے رہتے، ان میں بڑا مگرمچھ بھی شامل ہوتا۔

ایک دفعہ وہاں کے لوگوں نے ارادہ کر لیا کہ صبح جب آدم خور مگرمچھ نکلے تو اسے گولی سے مار دیں گے۔ اس لیے سب بندوقیں لے کر ندی سے ذرا دور صبح ہی صبح بیٹھ گئے۔

حسب معمول جب سورج نکلا تو سب مگرمچھ نکل آئے، ندی کے کنارے پر اُن کے ساتھ وہ بڑا مگرمچھ بھی تھا۔ لوگوں نے گولی چلائی ـــ گولی کی آواز سنتی تھی کہ مگرمچھ دریا کے اندر چلا گیا۔ اور لوگوں کی یہ ترکیب بھی ناکام رہی۔ اس طرح کوئی بھی مگرمچھ کو نہ مار سکتا تھا۔

ایک عرصہ گزر جانے کے بعد اسی بستی میں ایک انگریز شکاری آیا۔ اُس نے مگرمچھ کے بارے میں سنا تو اُس انگریز شکاری نے تہیہ کر لیا کہ مگرمچھ کو جب تک جان سے مار نہ دے تب تک چین سے نہ بیٹھے گا۔ اس لیے وہ مگرمچھ کو جان سے مار ڈالنے کی تیاریاں کرنے لگا۔

دوسرے روز صبح انگریز شکاری نے بندوق لی اور ساتھ میں دوربین بھی لے لی اور ندی کے کنارے سے تھوڑے دور جاکر بیٹھ گیا۔ جب سورج نکلا تو سارے مگرمچھ ندی کے کنارے پر آکر ریت میں لیٹنے لگے، مگر وہ بڑا مگرمچھ پانی پر ہی تیرتا رہا اور باہر نہیں نکلا۔ اس طرح انگریز شکاری اس خونخوار مگرمچھ کو مارنے میں کامیاب نہ ہوا۔

اسی ندی کے کنارے سے تھوڑے دور ایک جھونپڑی تھی۔ جس میں ایک

بڑھیا رہا کرتی تھی۔ بڑھیا کو اُس انگریز شکاری پر ہنسی آئی اور دل ہی دل میں کہنے لگی کہ یوں تو یہ شام تک بیٹھا رہے گا۔ تب بھی اس کے ہاتھ میں مگرمچھ نہیں آئے گا۔ اس لیے اس کی مدد کرنی چاہیے۔

یہ سوچ کر وہ انگریز شکاری کے پاس پہنچی، جو آنکھوں پر دُوربین چڑھائے بیٹھا تھا۔ بڑھیا نے اس انگریز شکاری سے کہا، "کہ آپ مجھے انعام دیں تو میں اس مگرمچھ کو ماردوں گی۔" انگریز شکاری ہنسنے لگا۔ کہ اتنے بڑے بڑے شکاری ناکام رہے اور تم کیسے اس خونخوار مگرمچھ کو مار سکو گی، پھر بھی اس انگریز شکاری نے پچاس رُپے انعام رکھ دیے۔

پھر بڑھیا نے اپنا کام شروع کر دیا۔ وہ کام یہ تھا کہ اس نے انگریز شکاری سے بکری کے دو بچے منگوائے۔ ان میں سے ایک کو اپنے پاس رکھا اور دوسرے کو کاٹ ڈالا اور اس کے اندر جتنا گوشت پوست تھا وہ سب نکال کر اس کے اندر چونا بھر دیا، اور پھر دھاگے سے سی دیا اور اس نقلی بچّے کو اپنے پاس رکھا اور اصلی بچّے کو ندی کے کنارے باندھ دیا۔ انگریز شکاری نے کہا "یہ مگرمچھ تو بکری کے بچّے کو کھا جائے گا۔" بڑھیا نے کہا، "دیکھتے رہو کیا ہوتا ہے۔"

دوپہر کا وقت تھا۔ مگرمچھ کو صبح سے شکار نہ ملا تھا۔ اس کو بھوک لگی ہوئی تھی اور بکری کا بچّہ بھی بھوکا تھا، اس لیے وہ "بے بے" کرنے لگا۔ بکری کی آواز سنی تھی کہ مگرمچھ نکلا اور بکری پر جھپٹا، لیکن کامیاب نہ ہو سکا، کیوں کہ بڑھیا لکڑی لیے اسی کے انتظار میں کھڑی تھی کہ نکلے اور اس کو لکڑی سے پیٹنا شروع کر دے۔ اس لیے مگرمچھ بھاگ گیا۔

پھر بڑھیا نے اصلی بچّے کو چھوڑ کر وہی نقلی بچّہ باندھ دیا۔ ایک آدھ گھنٹے بعد وہ مگرمچھ نکلا اور اس نقلی بچّے کو اٹھا لے گیا۔ بڑھیا ہنستی ہوئی اٹھی اور کہنے لگی اب دیکھو کیا حال ہوتا ہے مگرمچھ کا۔

وہ دونوں ندی کنارے پہنچے

اور ندی کے اندر دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ان کو آدم خور مگرمچھ نظر آیا، جو تڑپ رہا تھا اور اس کے منہ سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس بکری کو کھا گیا تھا جس میں چونا تھا۔ اس نے بکری کو کھا کر اس کے اوپر پانی پیا اس لیے اس کے پیٹ کے اندر آگ سی لگ گئی، کیوں کہ ہمیں معلوم ہے کہ اگر چونے کو پانی میں ملا دیا جائے تو وہ گرم پانی کی طرح ابلنے لگتا ہے۔ یہی حال مگرمچھ کا ہوا، اس لیے وہ ندی کے کنارے جا کر لیٹ گیا اور چیخیں مارنے لگا۔ سب لوگ جمع ہو گئے اور اس پر پتھروں کی بارش شروع کر دی، اس لیے مگرمچھ کو اور بھی تکلیف ہوئی اور وہ پانی میں چلا گیا۔ پانی میں جانا تھا کہ اس کا جسم پھر آگ کے موافق جلنے لگا اس لیے وہ پھر کنارے پر آ گیا۔ انگریز شکاری کو اس کی یہ حالت دیکھی نہ گئی اور بندوق لے کر اس پر گولی چلائی جو اس کے سر پر لگی اور مگرمچھ مر گیا۔

سب لوگ خوش ہوئے اور انگریز شکاری نے بڑھیا کو پچاس رُپے انعام دیے اور وہ اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس طرح وہاں کے لوگوں نے اس خونخوار مگرمچھ سے چھٹکارا حاصل کیا۔

(گجراتی سے ترجمہ)

ادلے کا بدلہ

ظہور الدین گُل۔ ڈیرہ غازی خاں



بہت پرانے زمانے کا ذکر ہے کہ سمندر میں ایک جزیرے پر بونوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ بونے ہنسی خوشی اپنی جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ دن میں تو وہ خوب کام کاج کرتے، اور جوں ہی رات ہوتی تو تمام بونے سمندر کے اُس پار جا کر وہاں سے کھانے پینے کی چیزیں لاتے تھے۔ کیوں کہ جزیرے میں کوئی بھی کھانے پینے کی چیز نہ ملتی تھی۔

سمندر پار وہ دو کشتیوں میں بیٹھ کر جاتے تھے۔ جو پہلے ہی سمندر کے کنارے پڑی ہوتی تھیں۔ ان کشتیوں کو دیکھ کر وہ حیران بھی ہوتے تھے کہ کون ایسا آدمی ہے، جو ان کے لیے روزانہ دو کشتیاں رکھ جاتا ہے۔

ایک دن صبح کے وقت چند بونے اچانک سمندر کے کنارے جا پہنچے۔ یہ دیکھ کر کہ کشتیاں غائب ہیں وہ بہت حیران ہوئے۔ پھر دل میں ڈرے بھی، مگر سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ معاملہ کیا ہے؟ تھوڑی دیر گم سُم کھڑے رہنے کے بعد سوچا کہ دیکھنا چاہیے کہ ہماری کشتیاں کون لے گیا ہے؟ اور قریب ہی چھپ کر دیکھنے لگے۔ انھیں پہلے ہی ڈر محسوس ہو رہا تھا، لیکن جی کڑا کرکے درختوں کے پتوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔

سارا دن اسی طرح بیٹھے ہوئے گزر گیا، شام کے وقت انھوں نے دیکھا۔ سمندر کے کنارے ایک بہت لمبا چوڑا دیو قامت آدمی آیا اس کے چلنے سے زمین ہل رہی تھی۔ سمندر کے بالکل قریب پہنچ کر اس نے پاؤں کے جوتے اتار دیے اور ننگے پاؤں واپس جانے لگا

دیو جب اس درخت کے قریب سے گزرا تو بونے سہم کر دبک گئے۔ دیو نے کہا، "دوستو! ڈرو نہیں میں تمھیں نقصان پہنچانے نہیں آیا۔"

دیو آگے بڑھ گیا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو سب بونے درخت سے نیچے اُترے۔ دیو کے جوتوں کے پاس گئے۔ اچنبھا ہوا تو جوتوں کے اردگرد گھومے۔ یقین نہ آیا تو آنکھیں ملیں۔ جوتوں کے اوپر چڑھ کے دیکھا۔ اندر جا کر ٹٹولا، پھر حیرت سے ایک دم بولے، "ارے یہ تو وہی ہماری کشتیاں ہیں۔" انھیں آج معلوم ہوا کہ جنھیں وہ کشتی سمجھ رہے تھے وہ تو دیو کے جوتے ہیں۔ پھر وہ بھاگم بھاگ بستی میں گئے اور سارا ماجرا اپنے ساتھیوں کو سنایا۔

بعض نے ان کی باتوں پر یقین نہیں کیا اور بعض نے کر لیا، لیکن یہ بات سن کر بونے دل میں ڈر ضرور گئے۔

چند ایک بونوں نے اُسے مارنے کا فیصلہ کر لیا۔ بعض نے کہا ایسا کرنا مشکل ہے۔ بوڑھوں نے سمجھایا اس نے ہمارا کیا بگاڑا ہے، جو ہم اُسے تکلیف دیں، لیکن ان بونوں نے کسی کی نہ سنی، بلکہ وہ دیو کو مارنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔ کوئی کہتا جب دیو کل وہاں آئے تو سب اس پر یک دم ہلہ بول دو، کوئی کہتا دور سے پتھر مارنے شروع کر دیں۔ کوئی کچھ کہتا اور کوئی کچھ، لیکن کام کی بات کوئی نہ کر سکا بہت سر کھپائی کے بعد ایک بونے نے کہا، "مجھے ایک ترکیب سوجھی ہے۔ وہ یہ کہ رات کو دیو کے جوتوں میں سوراخ کر کے اُس میں بڑی بڑی نوکیلی کیلیں گاڑ آئیں۔ جب دیو صبح کو جوتے پہنے گا تو کیلیں پاؤں میں چبھ جائیں گی اور دیو مر جائے گا۔ یہ ترکیب سب کو پسند آئی۔ اس رات انھوں نے ایسا ہی کیا، جوتوں میں بڑے بڑے سوراخ کر کے اس میں بڑے بڑے کانٹے دار کیلیں گاڑ دیں۔ یہ کام کر چکنے کے بعد نزدیک ہی چھپ کر بیٹھ گئے۔

صبح دیو آیا اور بغیر دیکھے بھالے جوتوں میں پاؤں ڈال دیے۔ کیلیں اس کے پاؤں میں چبھ گئیں، اُسی وقت خون کے فوارے چھوٹ پڑے اور بے چارہ دیو درد سے کراہنے لگا۔ درد کی شدت سے کھڑا نہ رہ سکا تو گر پڑا۔ اور تھوڑے عرصے بعد تڑپتے ہوئے دم توڑ دیا۔

یہ دیکھ کر بونے تالیاں بجاتے اور شور مچاتے باہر نکلے۔ وہ سب دیو کے مُردہ جسم پر ناچنے اور کودنے لگے۔ ان میں سے ایک بولا، "اب ہم صبح کے وقت بھی سمندر کی سیر کیا کریں گے۔" دوسرا بولا، "چلو! آج سمندر کی دور دور تک سیر کریں۔"

جھٹ آدھے ایک جوتے پر، آدھے دوسرے پر سوار ہو گئے اور کشتیوں (جوتے) کو سمندر میں ڈال دیا۔ ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ کشتیوں (جوتوں) میں پانی بھرنے لگا۔ خوشی اور جوش میں وہ یہ بھی بھول گئے کہ کشتیوں میں کئی سوراخ تھے، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ انھوں نے بہتیری کوشش

کی کہ پانی کشتیوں کے اندر آنا بند ہو جائے، وہاں تو کتنے ہی سوراخ تھے۔ آخر وہ کس کس کو بند کرتے؟ مدد کے لیے چیخ و پکار کی، لیکن صبح کے وقت کنارے پر بھلا کوئی کیا کرنے آتا؟ پانی تیزی سے اندر داخل ہوتا گیا۔ وہ جلد جلد واپس کنارے پر آنے لگے، لیکن کنارے پر پہنچنے سے پہلے ہی کشتی میں کافی پانی بھر چکا تھا۔ بس پھر کیا تھا کشتی ڈوب گئی اور ساتھ میں بونے بھی۔

دیکھا بچو! تم نے برائی کا نتیجہ؟ اگر بونے دیو کے جوتوں میں سوراخ نہ کرتے تو نہ ہی بے چارہ دیو مرتا اور نہ ہی وہ خود سمندر کی نذر ہوتے۔

محنت کا پھل

سلیم اللہ۔ کلکتہ



اختر آج بھی حسب دستور صبح ہی کو اٹھا، منہ ہاتھ دھونے کے بعد اپنی کتاب کھول کر توتلی زبان سے سبق یاد کرنے لگا۔ تھت بول (سچ بول) تام تر (کام کر)۔ تھبک یاد تر (سبق یاد کر)۔ ابھی تھوڑی ہی دیر پڑھتے ہوئے ہوئی ہوگی کہ اتنے میں اس کی ماں نے پیار سے اختر کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا، "بس بس بیٹا! اب بہت ہوا، اب ناشتہ کرلو۔" اختر نے سر اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا اور بے اختیار اپنی ماں سے لپٹ گیا۔ "ماں" اختر نے کہا ہم بڑے ہو کر ماسٹر بنیں گے، اپنے ماسٹر صاحب کے طرح۔ اختر کی ماں نے اس کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا، "ہاں ہاں بیٹا۔ تم ضرور ماسٹر بننا، چل ناشتہ کرلے اور اسکول جا۔" ناشتہ کے بعد اختر اپنے کتاب والے تھیلے کو سنبھالے ہوئے اور یہ کہتا ہوا چلا کہ "ہاں" ہم اسکول جا رہے ہیں اور اس کی ماں بھی اسے اسکول سے باہر چھوڑنے آئی اور کہا کہ "دیکھو بیٹا! اسکول میں کسی سے جھگڑا نہ کرنا۔ چھٹی ہوتے ہی گھر چلے آنا۔" اختر اسکول چلا اس کی ماں اسے اس وقت تک محبت بھری نظروں سے تکتی رہی

جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔

اختر اپنی ماں کے ساتھ ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں رہتا تھا، جو کہ گاؤں کے کنارے تھی۔ چند سال پہلے اختر کے والد گاؤں ہی میں ایک زمیندار کے گھر ملازم تھے۔ دونوں میاں بیوی (اختر کے والدین) ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن اُن دونوں کو ایک بات کا بہت دکھ تھا کہ اُن کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ دونوں اللہ سے اولاد کے لیے دعائیں مانگا کرتے۔ کافی دنوں بعد اللہ نے اُن دونوں کی دعا سن لی اور ایک چاند سا بچہ اختر پیدا ہوا۔ اختر کے والدین خوشی سے پھولے نہیں سمائے۔ اڑوس پڑوس میں مٹھائی بٹوائی اور پھر بڑے ہی ناز و نعم سے اختر کی پرورش ہونے لگی۔

کچھ ہی دنوں بعد اختر کے ابا سخت بیمار ہوئے اور لاکھ دوا علاج کے باوجود بھی غریب بیوہ اور یتیم اختر کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے چلے گئے۔ اختر کی ماں کا روتے روتے بُرا حال ہو گیا۔ اڑوس پڑوس کی عورتوں نے بہت سمجھایا بجھایا اور تسلّی دی، لیکن اختر کی ماں پاگلوں جیسی ہو گئی تھی۔ چند دنوں تک تو یہی حال رہا۔ پھر آہستہ آہستہ آنسو تھمے اور اُس نے بھی اپنے آپ کو تسلّی دی۔ اب اُسے اپنے اور اختر کے بارے میں خیال ہوا کہ جو سہارا تھا وہ تو ٹوٹ گیا۔ اب اپنی اور اختر کی زندگی گزارنے کے لیے کیا کیا جائے۔ آخر اس کے ذہن میں ایک بات آئی اور وہ گاؤں ہی کی عورتوں کے کپڑے وغیرہ سلائی کرنے لگی اور اُسی سے اس اُس کا گھر کا خرچ بمشکل چلتا رہا۔ غرض کہ اسی طرح دن گزرتے گئے اور اختر بھی پروان چڑھتا گیا۔

اختر کو گاؤں کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اس گاؤں سے کچھ دور ہائی اسکول میں گاؤں ہی کے ایک آدمی کے ذریعے داخل کروا دیا گیا۔ وہ خوب محنت سے پڑھنے لگا۔ اسکول سے آنے کے بعد وہ گھر کا سودا سلف لاکر ماں کو دے دیتا اور موقع پاکر ماں کے کاموں میں ہاتھ بھی بٹاتا تھا۔ شام کو

پڑھنے بیٹھ جاتا۔ اسکول کا دیا ہوا کام کرتا۔ غرض کہ اسی طرح کھانے کا وقت آتا اور اسی طرح کھاپی کر سو رہتا۔ اختر ہر سال اپنے درجہ میں اول آتا۔ اسکول کے تمام ماسٹر اختر کو چاہنے لگے اور خاص کر ہیڈ ماسٹر صاحب تو اُس پر بہت مہربان تھے انھوں نے اُس کی فیس بھی معاف کروادی تھی۔

آج اختر کے فائنل کا نتیجہ نکلنے والا تھا۔ صبح ہی صبح اٹھا نہا دھو کر ناشتہ کر کے اپنی ماں سے یہ کہہ کر اسکول چل دیا کہ آج نتیجہ نکلنے والا ہے، دعا کرو کہ میں پاس ہو جاؤں۔ اس کی ماں نے اختر کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا کہ "اللہ نے چاہا تو تم ضرور پاس ہو جاؤ گے"۔ اختر اسکول پہنچا، جماعت کے تمام لڑکے کلاس سے باہر اسکول کے گراؤنڈ میں بے چینی کے عالم میں اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ اختر بھی ایک ہم جماعت کے ساتھ ایک طرف ہو کر کچھ باتیں کرنے لگا۔ کیوں کہ ابھی تک نوٹس بورڈ پر فائنل کا نتیجہ نہیں لگایا گیا تھا۔ ابھی وہ باتیں ہی کر رہا تھا کہ

اچانک ایک دوسرے ہم جماعت نے آکر کہا کہ فائنل کا نتیجہ نوٹس بورڈ میں لگ گیا ہے۔ اتنا سنتے ہی اختر اور اس کے تمام ہم جماعت نوٹس بورڈ کے طرف لپکے اور اختر سب سے پہلے اپنا نام دیکھ کر اور یہ جان کر کہ مَیں اوّل آیا ہوں پھولا نہیں سمایا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اختر کو بلوایا اور وہ دھڑکتے دل کے ساتھ ہیڈ ماسٹر تک پہنچا۔ ہیڈ ماسٹر نے پیار سے اپنا ہاتھ اس کی پیٹھ پر تھپ تھپایا اور کہا کہ "شاباش اختر! تم نے میری اور اپنے اسکول کی لاج رکھ لی"۔ یہ سنتے ہی مارے خوشی کے اختر کی آنکھوں سے موٹے موٹے دو آنسو نکل پڑے۔ اب وہ نتیجہ لے کر تیز تیز قدموں سے اپنے گھر کی طرف چلا اور جلد ہی گھر پہنچ گیا۔ دور ہی سے اختر نے پکارا "اماں" اس کی ماں آواز سنتے ہی دوڑی آئی (جو کہ ابھی اللہ سے اختر کے پاس ہونے کی دعا کر رہی تھی)۔ اختر اپنی ماں سے لپٹ گیا اور خوشی کے آنسو دونوں کی آنکھوں سے رواں ہو گئے اور اختر کی ماں نے یہ جان کر کہ

میرا اختر اول آیا ہے۔ شکرانہ کی نماز پڑھی۔

ہیڈ ماسٹر نے اختر کو اپنے ہی اسکول میں ایک ماسٹر کی جگہ دی۔ اختر کی ماں اور اختر دونوں ہی خوش تھے، کیوں کہ اختر کی وہ بات جو بچپن میں کہا کرتا تھا کہ "میں بڑا ہو کر ماسٹر بنوں گا۔" آج پوری ہو گئی تھی۔ اختر نے شام کے کالج میں داخلہ لے لیا۔ آخر کار ایک دن ایسا بھی آیا کہ اختر سارے شہر میں اعزاز کے ساتھ بی۔ اے میں اول آیا اور گاؤں بھر میں اس کے نام کی دھوم مچ گئی۔ جس نے سنا تعریف کی۔

اب وہی توتلی زبان سے پڑھنے والا اختر آج ایک اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر بن گیا۔

ہیڈ ماسٹر نے اس کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے اختر کو اپنا داماد بنا لیا اور اختر اپنی ماں کے ساتھ ہنسی خوشی سے دن گزارنے لگا۔

★

پہیلی

تسلیم الٰہی زلفی۔
کراچی



رات میں دیکھو ڈاکو آیا
ساتھ میں اپنے چاقو لایا
کان پہ آیا ساز بجایا
پھر آنے کا راز بتایا
چاقو مارا، خون بہایا
نجمہ اور سلمہ کو رلایا
امی نے چادر کو اٹھایا
نجمہ اور تسلمہ کو اڑھایا
میں نے بنایا ہے جو کام
تم بتلاؤ اس کا نام
ان سے بچانا کوئی گھر
ان کو کہتے ہیں مچھر

بیٹھ کر چکی سے نمک کے لیے کہا تو نمک نکلنا شروع ہو گیا۔ اتفاق سے سوداگر چکی کو بند کرنے کا منتر بھول گیا اور جہاز نمک کے بوجھ سے ڈوب گیا۔ کہتے ہیں کہ اب اسی طرح چکی سے نمک نکل رہا ہے اور سمندر کا پانی اسی لیے نمکین ہے۔

شتر مرغ

محمد سلیم اختر۔
کوئٹہ



دنیا میں جتنے پرندے پائے جاتے ہیں، ان میں سب سے بڑا پرندہ شتر مرغ ہے۔ اگرچہ اس کے پر ہوتے ہیں، مگر یہ اُڑ نہیں سکتا، بلکہ یہ صرف دوڑنے والا پرندہ ہے۔

اس کا قد عام طور پر آٹھ فیٹ اونچا ہوتا ہے۔ اس کی گردن تین فیٹ لمبی ہوتی ہے۔ اس کی ٹانگیں بڑی مضبوط اور لمبی لمبی ہوتی ہیں۔ اس کے پاؤں میں پنجے کی بجائے انگوٹھا ہوتا ہے۔ جب یہ دوڑتا ہے تو سات سات آٹھ آٹھ گز لمبے ڈگ بھرتا ہوا جاتا ہے اور اس قدر تیز کہ تیز سے تیز گھوڑا بھی اس کی گرد کو نہیں پا سکتا۔

ایسے دوڑنے والے کے لیے رہنے کی جگہ بھی کھلے میدان ہی ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ یہ صرف افریقہ کے ریگستانی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کے پر نہایت قیمتی ہوتے ہیں اور ان پروں ہی کی وجہ سے اسے پکڑا جاتا ہے۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ جب اسے پکڑا جاتا ہے تو یہ سیدھا دوڑنے کے بجائے ایک دائرے کی صورت میں چکر لگانا شروع کر دیتا ہے۔ اور کند ذہن ہونے کی وجہ سے اپنا سر ریت میں چھپا لیتا ہے، کہ "جب وہ کسی کو نہیں دیکھ رہا ہے تو دوسرا بھی اسے نہیں دیکھ رہا ہے"! اپنی اس بے وقوفی سے پکڑا جاتا ہے۔

جنوبی افریقہ میں لوگ بڑے بڑے احاطے بنا کر شتر مرغ پال لیتے ہیں اور سال میں دو مرتبہ اس کے پر کاٹ کر بیچتے ہیں اور خوب روپیہ کماتے ہیں۔

...

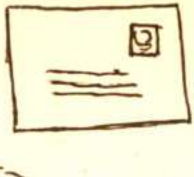
مجھے نمک چاہیے

سجاد احمد خان
ملتان



کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک گاؤں میں ایک بوڑھا آدمی رہا کرتا تھا، وہ بہت غریب تھا وہ ہر وقت یہی سوچتا کہ اپنے بال بچوں کو کس طرح پال سکے۔ ایک دن وہ قسمت آزمائی کے لیے گھر سے روانہ ہوگیا۔ راستے میں چلتے چلتے اسے ایک بوڑھی عورت ملی اس نے اس کو اپنی ساری کہانی سنادی اور کہا کہ مجھے کوئی نوکری دلادو، لیکن بڑھیا نے اس کو شیرینی دے کر کہا کہ "سیدھے چلے جاؤ، راستے میں ایک کنواں ملے گا۔ اس میں ایک چکی ہوگی، وہ اٹھالاؤ، لیکن کنویں کے اوپر دو سانپ بھی بیٹھے ہوں گے۔ ان کو پہلے جاکر یہ شیرینی دے دینا وہ یہ کھاتے رہیں گے اور ہاں ایک بات اور یاد رکھو کہ جب چکی اٹھاکر لاؤ گے، اس وقت کچھ عجیب آوازیں آئیں گی، لیکن تم ان کی طرف نہ مڑنا اور اپنے گھر چلے آنا۔" بوڑھے نے کہا اچھا اور روانہ ہوگیا۔ کچھ دور جاکر اسے ایک کنواں دکھائی دیا، جس پر دو سانپ بیٹھے تھے۔ بوڑھے آدمی نے ان کو شیرینی ڈال دی وہ اس کو کھانے لگ گئے۔

بوڑھے نے چکی اٹھالی اور گھر کی طرف روانہ ہوگیا اور اس نے آوازوں کی کوئی پرواہ نہ کی راستے میں اسے پھر بڑھیا مل گئی۔ اب بوڑھی نے کہا کہ "اب گھر چلے جاؤ اور چکی سے جو چیز مانگو گے، وہ تمھیں مل جائے گی۔" بوڑھا خوشی خوشی گھر آگیا اس طرح وہ امیر ہوگیا۔ ایک دن بوڑھے کی بیوی کی ایک سہیلی نے اس سے ان کے امیر ہوجانے کا راز پوچھا تو اس کی بیوی نے چکی کا جادو کہہ سنایا۔ ہوتے ہوتے اس گاؤں کے بڑے سوداگر کے پاس یہ خبر پہنچی۔ اس نے یہ سن کر وہ چکی لاکھوں روپے دے کر خرید لی وہ سوداگر نمک کا کاربار کرتا تھا۔ اس نے سمندری جہازیں



تمہارا خیال ہے



امتحان میں مدد ملی

ہمدرد نونہال نہ صرف خوب صورتی کی حد میں بڑھا ہوا ہے، بلکہ معیاری مضامین کی حد میں بھی اس نے کافی جگہ پیدا کر لی ہے۔ جس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ اِس کا پُرانے سے پُرانا رسالہ اُٹھا کر پڑھیں تب بھی وہی دلچسپی رہتی ہے۔ ایسا لگتا ہے، جیسے کوئی عمدہ کتاب پڑھ رہے ہیں، یعنی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ اگلے سال کے ہمدرد نونہال میں جبکہ ہمارے نویں جماعت کے بورڈ کے امتحانات ہو رہے تھے، اس مہینے کے ہمدرد نونہال میں پاکستان کے وزیروں گورنروں وغیرہ کی ایک معلوماتی فہرست شائع ہوئی تھی، جس سے ہم نے اپنے بورڈ کے امتحانوں کے زمانے میں اُسے یاد کر کے بہت فائدہ اُٹھایا تھا، جس کے لیے ہم بے حد شکر گزار ہیں اور ہمیں اُمید ہے کہ آئندہ ماہ بھی جبکہ ہمارے بورڈ کے امتحانات ہو رہے ہوں گے، آپ ہمدرد نونہال میں پہلے کی طرح اب کے بھی ویسی ہی فہرست شائع کر کے ہمیں شکریہ کا موقع دیں گے۔

اختیار احمد، کوکب رشدی، فیاض راہی زینت حیات، عذرا زیدی، طلعت رفعت، شہباز خاں ولی الدین، محمد اسلم۔

اور ڈراما "فرض" بہت پسند آئے۔

عبدالسلیم خاں۔ روہڑی

پابندی سے مطالعہ

غالباً دسمبر ۱۹۶۴ء کی ایک سہانی شام کو بھائی جان جب اسکول سے واپس آئے تو میرے لیے ایک رسالہ لے کر آئے اور مجھے دیا، تو پہلے تو میں نے سمجھا کہ کوئی معمولی رسالہ ہوگا، مگر جب اس کا مطالعہ کیا تو اس کو دوسرے رسالوں سے بہت بلند پایا۔ وہ رسالہ تھا "ہمدرد نونہال"۔

وہ رسالہ پڑھنے کے بعد میں بھائی جان سے ناراض ہوگئی کہ انھوں نے اس سے پہلے مجھے اتنے بلند پایہ رسالے سے متعارف کیوں نہیں کرایا۔ اس کے بعد سے اب میں ہر ماہ کا نونہال باقاعدگی سے منگوا کر پڑھتی ہوں اور ہر ماہ کی ۲۰ تاریخ سے ہی بھائی جان کو یاد دلانا شروع کردیتی ہوں کہ وہ میرے لیے نونہال ضرور لائیں۔ آج بھائی جان وعدہ کرکے گئے ہیں کہ وہ میرے لیے نونہال لائیں گے اور اب بھائی جان کی آمد کی نونہال لانے کی وجہ سے منتظر ہوں۔ میں آپ کو بچوں کے لیے اتنا بلند پایہ رسالے کے جاری کرنے پر دلی مبارک باد پیش کرتی ہوں۔

سلیمہ۔ نواب شاہ

پسندیدہ مضامین

پہلی مرتبہ ہمدرد نونہال نظر سے گزرا۔ مارچ کا پرچہ دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ اس دفعہ پرچے میں سب سے زیادہ قابلِ تعریف چیزیں "تار برقی کے موجد"، "عقل مند کسان"۔ نظم میں پہلی اور دوسری مضامین پسند آئے۔ میری طرف سے لکھنے والے نونہال بھائیوں کو آداب عرض ہے۔

سعید احمد خاں۔ ضلع پٹنہ

لاجواب رسالہ

نونہال پڑھا، بہت پسند آیا۔ اس کا سرورق بڑا شاندار تھا۔ دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ اگر آپ سائنسی معلومات برابر دینے لگ جائیں تو ہمارا رسالہ دن رات دوگنی اور چوگنی ترقی کرے گا۔

ارشد زماں۔ کراچی

سفید کاغذ

نونہال نظر سے گزرا۔ مجموعی طور پر اچھا تھا۔ ایسے پرچے میں رف کاغذ ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔ مضامین اور نظمیں عمدہ تھیں۔ علی ناصر زیدی صاحب کے مضامین کافی معلوماتی ہوتے ہیں۔ ٹکٹوں کے بارے میں خبروں اور حاشیوں کے لیے بھی جگہ وقف ہونی چاہیے۔ مسلمان رہنماؤں کے بارے میں مضامین شائع ہونے چاہییں۔ میں ہر ماہ نونہال منگواتا ہوں، لیکن بس خاکی کاغذ پر چھپا ہوا دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے۔ سفید کاغذ پر چھپا کریں تو اچھا ہو۔

محمد ارشاد حسین صدیقی۔ حیدرآباد

آپ دوسرا کھُردرا کاغذ استعمال کیا کریں ۔ جب رسالے کے اندر سیر کے لیے گئے تو اتنے پیارے پھول اور اُن کی مہک ، سبحان اللہ! کیا شان ہے نونہال کی۔

سب سے عمدہ کہانی "ایک کارآمد شرارت" تھی ۔ جناب عشرت رحمانی صاحب کو میری طرف سے مبارک باد پہنچا دیں ۔ علاوہ ازیں سب کہانیاں عمدہ تھیں ۔ آپ رسالے کو دل کش بنانے کے لیے انعامی مشغلے زیادہ کر دیں ۔ ہر مہینے نیا نیا کارٹون ہو یا کوئی ذہنی اور تعلیمی قسم کا مشغلہ شروع کر دیں ۔

غلام حسین ہاشمی ۔ پنڈی گھیب

تصویریں

اپریل کا ہمدرد نونہال پڑھا ۔ سچ کہتی ہوں کہ بس پڑھ کر باچھیں ہی کھل گئیں ۔ کس کس کی تعریف کی جائے ۔ غرضیکہ ہر ایک مضمون لاجواب تھا ، لیکن میں ایک تجویز پیش کرتی ہوں کہ اگر آپ اس میں اور رسالوں کی طرح قلمی دوستی کرنے والے نونہالوں کے فوٹو بھی چھاپا کریں تو اچھا ہوگا ۔ میں اُمید رکھتی ہوں کہ آپ اور باقی بہن بھائی بھی میری اس تجویز سے اتفاق کریں گے ۔

زرینہ نسرین ۔ نوشہرہ

سرورق، کیا کہنے

اپریل کا شمارہ دیکھا ، پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی ۔ ٹائٹل کے تو کیا کہنے ۔ دیکھنے کا دیکھتا ہی رہ گیا ۔ ہمارے پیارے رسالے نے اب تو بہت ترقی کر لی ہے ۔ اس ترقی پر میری طرف سے مبارکباد قبول کیجیے ۔ اب تو ہمارا پیارا رسالہ تعریف کا محتاج نہیں رہا ۔ بھائی جان ، کیا بتاؤں یہ رسالہ مجھے اتنا پسند ہے کہ ہر ماہ بڑی بے چینی سے انتظار کرتا ہوں ۔ اس مرتبہ "بٹوہ کالا خوب نکالا" ، "میں تم سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں" ، "بلی بھوت اور اُلّو" ، "سو بیٹوں کا باپ" نونہال ادیب کے صفحات ۔ معلوماتی مضمون اور "فرض" ڈراما بھی بے حد پسند آیا ۔

مختار احمد ۔ کراچی

سائنسی مضامین

آج اپریل کا ہمدرد نونہال دیکھا ، خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی ۔ سرورق کا تو جواب نہیں ۔ مصور کو میری طرف سے مبارک باد پہنچا دیں ۔ رسالہ ملتے ہی سارا رسالہ پڑھ ڈالا ۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ ہمارا رسالہ دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے ۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں ۔ خاص طور سے اس کے مضامین بہت ہی دل چسپ ، سبق آموز اور ہر لحاظ سے عمدہ تھے ۔ اس میں آپ نے سائنسی اور جغرافیائی مضامین چھاپ کر اس رسالہ کو صحیح معنوں میں ایک ایسا رسالہ بنا دیا ، جو ایک مہذب طبقے کے لیے بہت ہی فائدہ مند ثابت ہوگا ۔ مضامین میں "چاند کی پہلی کرن" ، "افریقہ کے جنگل میں چھے دن"

دل چسپ اور معلوماتی

ہمدرد نونہال پہلی بار دیکھنے کا اتفاق اس وقت ہوا جبکہ ہمارے دارالمطالعہ کے لیے ہمارے ایک سرپرست صاحب نے اسے بطور عطیہ دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے علاوہ دارالمطالعہ میں مطالعہ کرنے والے بچوں نے بھی اسے پسند کیا اور آپ کی کوششوں کو سراہا۔ اخبار نونہال بہت ہی حسین ہونے کے ساتھ معلوماتی مضمون ہے۔

ایس۔اے۔رشید اقبال، کراچی

ہر لحاظ سے بلند

کافی عرصے سے نونہال زیر مطالعہ ہے۔ بچوں کے علاوہ بڑوں کے لیے بھی بڑا دل چسپ پایا ہے۔ جس تھوڑے سے عرصے میں اس نے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ نونہال بچوں کا بہترین ساتھی اور گراں قدر تحفہ ہے، جو آپ جیسے ہمدردوں کے طفیل نصیب ہوا ہے۔

گھر میں اور جتنے رسالے بچوں کے کے آتے ہیں، ان میں مَیں نے "نونہال" کو ہر لحاظ سے بلند پایا ہے۔

آر۔ رحمٰن قاضی رحیم یار خاں

پہیلیاں

رسالہ پڑھ کر نہایت خوشی حاصل ہوئی

اس دفعہ کا ٹائیٹل بہت پیارا ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ ہمارا نونہال دن بدن ترقی کر رہا ہے۔ اگر یہ ترقی کی راہوں میں گامزن رہا تو وہ دن دُور نہیں کہ یہ دنیا کے بڑے بڑے رسالوں میں شمار ہونے لگے۔ ہمارے نونہال میں دو تین صفحے پہیلیوں کے بھی ہونے چاہییں، تاکہ پڑھنے کا مزہ دوبالا ہو جائے۔ کہانی "باغ کے رکھوالے نے کبھی پھل نہیں کھایا" بہت اچھی ہے۔

منور پروین۔ کراچی

ہمارے نامور شاعر

مارچ ۱۹۶۵ء کا شمارہ ملا۔ سرورق دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ اس شمارے میں ویسے تو تمام مضامین اچھے تھے، لیکن پال بنیان کی جناتی گھڑی، بچوں کا طرحی مشاعرہ، اُوسان، ابنِ رشد، عقل مند کون؟ بے حد پسند آئیں۔

خاص کر مولانا الطاف حسین حالی کی نظم "موچی" تو بے حد پسند آئی۔ میری رائے ہے کہ آپ آئندہ بھی ہمارے نامور شاعروں کی نظمیں چھاپا کریں، تاکہ ہم ان سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔

محمد اختر متین۔ کوٹ سمابہ

کارٹون

اپریل ۱۹۶۵ء کا شمارہ جونہی کور سے نکالا، تو اتنا پیارا ٹائیٹل دیکھ کر غش کھاتے کھاتے بچا، مگر پھر خیال آیا، کہ ٹائیٹل کا کاغذ چکنا تھا،

حلقۂ دوستی



ریاض احمد چغتائی۔ کراچی

عمر: ۱۵ سال تعلیم: دہم

دل چسپیاں: ٹکٹ جمع کرنا۔ مطالعہ

پتہ: ۳۸۔ ایف جہانگیر روڈ پٹیل پاڑہ کراچی

عارف محمود قریشی۔ ملتان

عمر: ۱۷ سال تعلیم: دہم

دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ مضمون نگاری

پتہ: بزم کارواں حسین اگاہی ۱۰۹/۴ ملتان

سرفراز حسین - کراچی

عمر: ۱۵ سال تعلیم: دہم

دل چسپیاں: کرکٹ کھیلنا۔ مطالعہ

پتہ: کوارٹر ۵ بلاک ۹/ا پریڈی تھانہ صدر۔ کراچی

ارشد اقبال خاں۔ لاہور

عمر: ۱۰ سال - تعلیم پنجم

دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ کھیلنا

پتہ: معرفت چوہدری محمد ایوب صاحب نظامی۔ کریم اسٹریٹ۔ عبدالکریم روڈ۔ قلعہ گوجر سنگھ۔ لاہور

عبدالمجید خاں مجید۔ کراچی

عمر: ۱۴ سال تعلیم: ہشتم

دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ شاعری

پتہ: بلاک نمبر ۵ کوارٹر نمبر ۳۲۳ لیاقت آباد کراچی ۱۹

اقبال عبدالرحمٰن - کراچی
عمر: ۱۴ سال تعلیم: ہشتم
دل چسپیاں: قلمی دوستی
پتہ: ۶۴ مجیدی بلڈنگ فریر روڈ - کراچی

عبدالرشید سہارن - جھنگ
عمر: ۱۷ سال تعلیم: نہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی
پتہ: عبدالرشید سہارن ولد عبدالمجید سہارن
محلہ شاہ برہان چنیوٹ ضلع جھنگ

بشیر احمد - شہداد کوٹ
عمر: ۱۴ سال تعلیم: نہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی
پتہ: معرفت احمد نواز بلوچ بیدار - سیلرا
شہداد کوٹ

محمد یعقوب احمد - رنگ پور
عمر: ۱۴ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: فٹ بال - مطالعہ
پتہ: محمد یعقوب احمد - درجہ دہم - رول نمبر ۱۳۲
ہائی اسکول لال میز بان ضلع رنگ پور مشرقی پاکستان

منظور احمد شاہین - منٹگمری
عمر: ۱۶ سال تعلیم: سیکنڈ ایر
دل چسپیاں: شعر و شاعری - مطالعہ
پتہ: چک [illegible] جبیڈی تحصیل اوکاڑہ ضلع منٹگمری

پرس رام - سکھر
عمر: ۱۷ سال تعلیم: بارھویں
دل چسپیاں: قلمی دوستی - مطالعہ
پتہ: ۳۷/ ہندو دھرم شالہ - اسٹیشن روڈ سکھر

کوثر یاسمین راہوالی - گوجرانوالہ
عمر: ۱۲ سال - تعلیم: ہشتم
دل چسپیاں: قلمی دوستی - مطالعہ
پتہ: معرفت فاروق محمد خان - سی - او - ڈی
کواپریٹو شوگر ملز راہوالی ضلع گوجرانوالہ

طارق سلیم احمد - کراچی
عمر: ۱۳½ سال تعلیم: ہشتم
دل چسپیاں: قلمی دوستی
پتہ: معرفت کراچی بک ڈپو - ۲/۲۴۹
جوہر آباد کراچی نمبر ۱۹

محمد رفیق ہمدرد - شیخوپورہ
عمر: ۱۶ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: مطالعہ
پتہ: ایم - آر ہمدرد - ہمدرد کتب خانہ
ننکانہ صاحب - ضلع شیخوپورہ

منذر حفیظ - ملتان
عمر: ۱۰ سال تعلیم: ہفتم
دل چسپیاں: ٹکٹ جمع کرنا - کرکٹ -
پتہ: معرفت میاں عبدالحفیظ کاٹن انسپکٹر میلسی - ملتان

صبیحہ قربان علی ۔ کوئٹہ

عمر: ۱۱ سال تعلیم: ششم

دل چسپیاں: مطالعہ

پتہ: صبیحہ قربان علی ۔ پرنس روڈ ۔ کوئٹہ

محمد اکرم رضوی ۔ سیالکوٹ

عمر: ۱۷ سال تعلیم: سیکنڈ ائیر

دل چسپیاں: قلمی دوستی ۔ مطالعہ

پتہ: چوہدری محمد اکرم گھمن جیٹھی کے محلہ مشرقی
ضلع سیالکوٹ ۔ ڈاک خانہ خاص

انوار الحق آزاد ۔ رحیم یار خاں

عمر: ۱۲ سال تعلیم: ہشتم

دل چسپیاں: رسالے پڑھنا

پتہ: معرفت: شیخ نذیر حسین لیدر مرچنٹ رحیم یار خاں

عرفان احمد ۔ گوجرانوالہ

عمر: ۱۸ سال تعلیم سیکنڈ ائیر

دل چسپیاں: فوٹو گرافی ۔ قلمی دوستی

پتہ: معرفت ایم شکیب 15/1 کرشن نگر
جی۔ٹی روڈ ۔ گوجرانوالہ

نثار سرور کھارہ ۔ ملتان

عمر: ۱۷ سال تعلیم: سیکنڈ ائیر

دل چسپیاں: مطالعہ ۔ ہاکی کھیلنا

پتہ: مکان نمبر ۲۵۸۵ ۔ آفیشل کالونی
پل موج دریا ۔ ملتان شہر

محمد فاروق صدیقی ۔ خانیوال

عمر: ۱۵ سال تعلیم: ہشتم

دل چسپیاں: کرکٹ ۔ مطالعہ

پتہ: بلاک نمبر ۲ گلی نمبر ۴ مکان نمبر ۱۴/اے خانیوال

ایم ۔ اے نسیم ۔ گجرات

عمر: ۱۸ سال تعلیم: دہم

دل چسپیاں: قلمی دوستی

پتہ: ایم ۔ اے ۔ نسیم سکنہ سیدہ ڈاک خانہ
دولت نگر ۔ ضلع گجرات

سید نیر رضا ۔ منٹگمری

عمر: ۱۷ سال تعلیم: فرسٹ ائیر

دل چسپیاں: فوٹو گرافی ۔ قلمی دوستی

پتہ: نیر رضا گلی مسجد مائی والی ۔ منٹگمری

محمد بشیر حسین انصاری احمد پور شرقیہ

عمر: ۱۴ سال تعلیم: نہم

دل چسپیاں: مطالعہ، ٹکٹ جمع کرنا

پتہ: معرفت حمید الحسین انصاری وکیل
محلہ شکاری، احمد پور شرقیہ

خوشنود الرحمٰن ۔ لاہور

عمر: ۱۷ سال تعلیم: نہم

دل چسپیاں: قلمی دوستی

پتہ: بنگلہ ۱۳۳۵/ایچ حویلی معراں اکبری منڈی
لاہور

سراج الدین سلیمانی۔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں
عمر: ۱۱ سال تعلیم: ششم
دل چسپیاں: قلمی دوستی
پتہ: سراج الدین سلیمانی التمش منزل
سوہارا اسٹریٹ ڈیرہ اسمٰعیل خاں

نیلوفر ۔ کراچی
عمر: ۱۴ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: مصوّری قلمی دوستی
پتہ: جلال الدین منزل فلیٹ نمبر ۷
برنس روڈ ۔ کراچی

شاہدہ محبوب ۔ لائل پور
عمر: ۱۱ سال تعلیم: پنجم
دل چسپیاں: قلمی دوستی ۔ ٹکٹ جمع کرنا
پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۱۸ دی نیشنل سلک
اینڈ ریان ملز لمیٹڈ ۔ لائل پور

گلزار حسین ۔ لائل پور
عمر: ۱۱ سال تعلیم: چہارم
دل چسپیاں: نونہال پڑھنا
پتہ: ہرچرن پورہ ۲ گلی ۵
مکان نمبر ۱۵۶ ۔ لائل پور

فارم حلقۂ دوستی

نام:
عمر:
تعلیم:
دل چسپیاں:
پتہ:

اِن الفاظ کے معنی کیا ہیں؟

آغاز : ابتدا، شروع
اچنبھا: تعجب، حیرت
ادھورا: وہ کام جو پورا نہ ہوا ہو
اعزاز: عزت دینا، عزت، رُتبہ
ایال : گھوڑے کی گردن، بڑے بڑے بال
پرت : چھلکا، پپڑی، تہہ
پولا : نرم، اندر سے خالی
پیندا : تَلا، تلی، برتن کے نیچے کا حصّہ
تعاون: ایک دوسرے کی مدد کرنا
جاگیردار: جاگیر کا مالک
جانباز: جان پر کھیل جانے والا، بڑا محنتی
چُنّٹ : سلوٹ، کپڑے کی شِکن
حکم عدولی : نافرمانی کرنا، حکم نہ ماننا
حوصلہ : دلیری، ہمت
خوش نما : دل چسپ، خوب صورت
ڈنک : زہریلا کانٹا، سانپ یا بچھّو کا ڈنک
راز : چھپی ہوئی بات
روشن: چمکتا ہوا، صاف، کشادہ
ساز : باجا
سپاٹ: وہ چیز جو گھِس کر برابر ہو جائے، صاف سادہ

سدابہار : ہمیشہ سرسبز اور تازہ رہنے والا
سرچشمہ : وہ جگہ جہاں سے چشمہ نکلتا ہے، پانی نکلنے کی جگہ
سرفروش : دلیر، بہادر، قربانی دینے والا
سماں : وقت، زمانہ، موقع محل
شال : اُونی ریشمی چادر
شل : اپاہج، سُست
شیخی : بڑائی یا گھمنڈ کی باتیں
طیش : غصّہ، جوش
عَضلات: عَضلہ کی جمع : معنی، عدلہ کی بوٹی
غرور : تکبر، گھمنڈ
غش کھانا : بے ہوش ہو جانا
غوطہ : ڈبکی، پانی میں ڈوبنا
فضول : بے کار، فالتو
فلسفی : حکمت اور دانائی کا جاننے والا
فہم : سمجھ، عقل
فیاض : سخی
کرتب : کام، ہنر، سپہ گری کا ہنر
کرشمہ : عجیب بات، انوکھی بات
کوچوان : گھوڑا گاڑی چلانے والا یا ہانکنے والا
مصمم : پکا، مضبوط

حکیم حافظ محمد سعید ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے زین پیکیجنگ انڈسٹریز کراچی میں چھپوا کر ادارۂ مطبوعاتِ ہمدرد ناظم آباد کراچی ۱۸ سے شائع کیا



مئی ۱۹۶۵ء

رجسٹرڈ ایس نمبر ۱۹۰۳

ہمدرد

نونہال

پانچواں شمارہ

بارھویں جلد

اس رسالے میں کیا ہے؟

قیمت: ایک رسالہ ۷۵ پیسے —— سالانہ آٹھ روپے